اسلام اور غیر اسلامی تہذیب

سلسلۂ مطبوعات مجلس
۸۴

اسلام اور غیر اسلامی تہذیب

ترجمۂ "اقتضاء الصراط المستقیم"

جس میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی اسلامی و غیر اسلامی تہذیبوں کے حدود، غیر مسلم قوموں سے مشابہت اور بدعات پر کتاب و سنت کی روشنی میں حکیمانہ اور ایمان افروز انداز میں کلام کیا ہے۔

تلخیص و ترجمہ

مولوی شمس تبریز خاں

رفیق مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

بار سوم

۱۳۹۹ھ - ۱۹۷۹ء

کتابت ــــــــــ ظہیر احمد کاکوروی

طباعت ــــــــــ لکھنؤ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ (آفسٹ)

صفحات ــــــــــ ۱۹۶

قیمت ــــــــــ نو روپے

باہتمام

محمد غیاث الدین ندوی

طابع وناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

(دار العلوم ندوۃ العلماء)

فہرست

پیش لفظ

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، امابعد! پیش نظر کتاب "اسلام اور غیر اسلامی تہذیب" کو جو شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کی جلیل القدر تصنیف "اقتضاء الصراط المستقیم، مخالفۃ أصحاب الجحیم" کا آزاد ترجمہ اور تلخیص ہے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی طرف سے پیش کرنے میں ان سطور کے راقم کو وہ خوشی محسوس ہو رہی ہے، جو ایک اہم فریضہ کے ادا اور ایک قیمتی تحفہ کے پیش کرنے میں محسوس کی جاتی ہے، اس کتاب کی طباعت سے ایک دیرینہ آرزو پوری ہوئی، اس لئے کہ بر اعظم کے مسلمان عام طور پر اور ہندوستان کی مسلم اقلیت جو اپنی بہت سی خصوصیات کی بنا پر ایک ملت کہلانے کی مستحق ہے خاص طور پر جن نازک حالات سے گذر رہی ہے، اور اخذ و استفادہ تعلق و اختلاط، وسعت قلب و رواداری میں حسب احتیاط کی ضرورت، تہذیب و معاشرت، عادات و خصائص، مذہبی اور قومی تقریبات اور لباس و شعائر کے مسائل میں مسلمانوں کا رویہ متعین کرنے نیز ایک صاحب عقیدہ اور صاحب شریعت گروہ کی ثبات و استقامت اور نفرت و تعصب، خود شناسی و خود اعتمادی اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل، اپنے ملی وجود کی بقا اور اپنی ملی خصوصیات کی حفاظت اور اغیار کے معاملہ میں جارحانہ طرز عمل کے درمیان باریک لیکن واضح اور معین سرحدی لکیر کھینچنے کا جو نازک اور دشوار کام اس وقت پیش آگیا ہے، اس کے لئے عرصہ سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، کہ اس بارے میں قرآن و حدیث کی تعلیمات، شریعت اسلامی کی ہدایات اور اقوام و ملل اور مذاہب و ادیان کی تاریخ کے تجربات اس طرح پیش کئے جائیں کہ مسلمان ان کی روشنی میں ہندوستان

جیسے ملک میں جو رنگا رنگ تہذیبوں اور فلسفوں کا مخزن ہے اور جہاں کا ذہن ان مسائل میں زیادہ ذکی الحس واقع ہوا ہے اپنا مقام و موقف متعین کرسکیں۔

شیخ الاسلام کی یہ کتاب شروع سے راقم سطور کی منتخب و پسندیدہ کتابوں میں تھی لیکن ۱۹۵۰ء میں جب اس کا نیا اڈیشن مطبعۃ انصار السنۃ" قاہرہ سے شیخ محمد حامد الفقی کے تحقیق و تحشیہ کے ساتھ شائع ہوا، اور فاضل ناشر و محشی نے مکہ معظمہ میں خود وہ کتاب راقم کو عنایت فرمائی اس وقت سے دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ اسکو مناسب اختصار و انتخاب کے ساتھ اردو کے پیرایہ میں پیش کیا جائے، اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتاً ذمہ داریوں کے پیش نظر یہ کام بعض عزیزوں کے سپرد کیا لیکن وہ انجام نہ پاسکا، مقام مسرت ہے کہ اب عزیز گرامی مولوی شمس تبریز خاں رفیق مجلس تحقیقات و نشریات اسلام نے اس کی تکمیل کی انھوں نے اس فرض کو حسب معمول بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا، انھوں نے ترجمہ کو زیادہ عام فہم، دلچسپ و شگفتہ بنانے اور کتاب کو زیادہ مفید، عصر حاضر کے مطابق اور ہندوستان کے حالات سے قریب کرنے کیلئے اجتہاد سے کام لیا، جا بجا تشریحی اور تمہیدی عبارتوں، دعوے کو مفصل و مدلل کرنے کیلئے بعض نئے مصنفین کی کتابوں کے نقول و اقتباسات کا اضافہ کیا، جدید انگریزی مآخذ اور مستند انسائیکلوپیڈیا سے دعوے کے ثبوت میں شہادتیں اور طویل اقتباسات پیش کیے اپنے ادبی ذوق کی بنا پر عربی فارسی اور اردو کے اشعار حتی کہ معاصر شعراء کے اشعار نقل کرنے میں بھی انھوں نے تکلف سے کام نہیں لیا، شیخ الاسلام کے دریائے بے کراں اور سیل رواں کو کوزہ میں بند کرنا آسان کام نہیں تھا، انکے متکلمانہ طرز استدلال، وہبی و فطری اسلوب نگارش اور آبشار کے مانند قلم کے جوش اور معلومات کے وفور اور نکتہ آفرینیوں کی کثرت کو موجودہ مذاق کے مطابق ربط و نظم میں لانا معمولی کام نہ تھا لیکن مترجم نے اس مرحلہ کو بڑی کامیابی سے طے کیا اور اس کتاب کو اردو میں اس طرح ڈھال دیا کہ اس نے اس موضوع پر ایک مرتب و مکمل مضمون کی ایسی شکل اختیار کرلی کہ پڑھنے والے کو کوئی نشیب و فراز، اعادہ و تکرار اور طوالت و اطناب محسوس نہیں ہوگا، اس موضوع پر غالباً اردو میں پہلی مرتبہ ایک ایسی کتاب آرہی ہے جو اس مسئلہ پر قول فیصل کا اور جہاں تک مواد و معلومات اور دلائل و وثائق کا تعلق ہے ایک مختصر دائرۃ المعارف کا درجہ رکھتی ہے۔

جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے اسپر مصنفِ علّام نے اپنی عادت کے مطابق کچھ کہنے اور لکھنے کی گنجائش نہیں چھوڑی لیکن اتنا کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ علم جدید اور انفرادی و اجتماعی نفسیات کے مطالعہ نے اب جو چند حقیقتیں عالم آشکارا کردی ہیں اور تہذیب و معاشرت، شعائر اور عادات و خصائص کے جن اثرات کا مکرر و مسلسل تجربہ بخصوصیت کے ساتھ اس صدی کے آغاز سے ہو رہا ہے، انہوں نے اس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح واضح کردیا ہے کہ تہذیبوں اور معاشرتوں کا مسئلہ اتنا سرسری اور سطحی نہیں جتنا کچھ عرصہ قبل سمجھا جاتا رہا ہے، اور جیسا کہ اس صدی کے آغاز میں مغربی تہذیب کے اختیار کرنے کی دعوت دینے والوں نے اور اس صدی کے وسط میں قومی یکجہتی کے علمبرداروں نے پیش کیا، اب یہ بات مسلمہ حقیقت بن گئی ہے کہ عادات و معمولات، میلانات و رجحانات قلب و دماغ میں اپنی گہری جڑیں رکھتے ہیں، اور اقوام و ملل کی صورت گری اور شخصیت سازی میں ان کا بڑا گہرا اثر ہے، تہذیب، جذبات و رجحانات، پسندیدگی و ناپسندیدگی اور ذہنی رویہ کی بیرونی شکل ہوتی ہے، تہذیب کے مضمرات اور اس کے عناصر ترکیبی کو کسی خوردبین سے بھی نہیں دیکھا جاسکتا، اس کے خمیر میں شرک، جہل، ظلم، تکبر، تعیش کے رجحانات اور غفلت کے عناصر و اجزا کس تناسب سے شامل ہیں، اور وہ اس کا کیسا جزءِ لاینفک بن گئے ہیں، اس تہذیب نے کن فکری، نفسیاتی، اخلاقی، سیاسی و اقتصادی حالات میں پرورش پائی ہے، اور ارتقاء کے منازل طے کئے ہیں، اور انھوں نے اس پر اپنی کیسی گہری چھاپ اور انمٹ نقش چھوڑا ہے، اسکی تحلیل و تجزیہ کا کام فلسفۂ اجتماعات کے بڑے سے بڑے عالم و مؤرخ کیلئے بھی آسان نہیں ہے، اور اس کیلئے ابھی تک کوئی کیمیاوی معمل قائم نہیں ہوا جہاں اسکے تجزیہ و تحقیق کا کام کامیابی کے ساتھ انجام دیا جاسکے، اخذ و قبول اور تقلید و اقتباس کا عمل جو تہذیبوں اور معاشرتوں کے میدان میں انجام پاتا ہے، ملت کی نفسیات پر کس قدر اثرانداز ہوتا ہے، اسکو اپنے اصل مقام سے کس قدر ہٹا دیتا ہے، بر و اثم، طاعت و معصیت، اسلام و جاہلیت، حیا و بے حیائی، عدل و ظلم اور قناعت و اسراف کے پیمانے اس سے کس طرح بدل جاتے ہیں، اور وہ ملت اپنی ظاہری شکل اور خول میں رہتے ہوئے اندر سے کس قدر تبدیل ہوجاتی ہے اسکا صحیح اندازہ کرنا بڑے سے بڑے باریک بیں رہنما اور مصلح کیلئے بھی ممکن نہیں یہ خدائے علیم و خبیر ہی کی ذات ہے، جو دین و شریعت اور کتاب الٰہی کے نصوص و احکام کے ذریعہ اس ملت کی حفاظت کا انتظام کرتی ہے جسکو دنیا میں اپنی جداگانہ شخصیت کے ساتھ باقی رکھنا اور اس سے

دعوت ورہنمائی کا کام لینا ہوتا ہے، مشابہت وتقلید کے بارے میں اسلام کی بڑھی ہوئی احتیاط اور اسلامی تعلیمات کا زیادہ مفصل ومعین ہونا اور ان پر شریعت اسلامی کا اصرار اس بات کا نتیجہ ہے کہ اسلام محض چند عقائد ورسوم کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ پورے مسلک زندگی کا حامل وداعی ہے، اور وہ "صبغۃ اللہ، ومن احسن من اللہ صبغۃ" کا نعرہ لگاتا ہے، اور ہر اس تہذیب ومعاشرت کو جاہلیت کا نام دیتا ہے جس کا سرچشمہ حکم الٰہی اور ہدایت ربانی کے بجائے ہوا وہوس، مصلحت و مفاد، لذت وعزت یا محض تجربہ وقیاس ہو، اس نے پہلی مرتبہ اس حقیقت سے نقاب کشائی کی ہے کہ کوئی انسانی فرد مجرد عقائد پر زندگی نہیں گذار سکتا اور تہذیب ومعاشرت کو عادات واخلاق اور عقائد وعبادات پر اثر انداز ہونے سے روکا نہیں جا سکتا، ان دونوں کے درمیان دیوار کھڑی کرنے کی کوشش غیر فطری ہے، جو نشأت ثانیہ کے موقعہ پر مغربی تہذیب نے مذہب کو انسان کا پرائیوٹ معاملہ قرار دینے کی صورت میں کی، انسان کی زندگی منفرق اکائیوں کا مجموعہ نہیں جن کو جب چاہا ملا دیا، جب چاہا الگ کر دیا بلکہ وہ خود ایک اکائی ہے، اور اس اکائی کو "عبودیت"، "اسلام"، "دین"، اور "طاعت" کے کسی لفظ سے ادا کیا جا سکتا ہے، اور یہی تفسیر ہے، فرمانِ خداوندی "یا ایہا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین" کی۔

امید ہے کہ یہ کتاب اس اہم ونازک موقعہ پر جب ہندوستان کے مسلمان اپنی ملی شخصیت کی بقا اور اپنے ملی خصائص کی حفاظت کے فیصلہ کن معرکہ سے دوچار ہیں، اور غالباً اپنی پوری تاریخ کے جو اس ملک میں ان کے داخلہ کے وقت سے شروع ہوتی ہے سب سے نازک مرحلہ میں داخل ہو رہے ہیں، ایک مفید خدمت انجام دے گی، اور ان اصحاب ضمیر، خداترس وخودشناس مسلمان مفکرین اور رہنماؤں کو جو اس ملت کو موجودہ حالات میں صحیح مشورہ دینا چاہتے ہیں، صحیح روشنی عطا کرے گی "لیہلک من ہلک عن بینۃ ویحیی من حیّ عن بینۃ"۔

خدا کرے یہ توقعات پوری ہوں اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی یہ تازہ پیشکش اس اہم مقصد کو پورا کرے جو مجلس کے قیام کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ وما التوفیق الا من عند اللہ۔

۴ر شوال المکرم ۱۳۹۴ھ
۲۱ر اکتوبر ۱۹۷۴ء

ابوالحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

کتاب سے پہلے

مسئلۂ تشبہ اسلامی تہذیب کا ایک بنیادی عنصر ہے، لا الٰہ الا اللہ پر ایمان رکھنے والی قوم جب تہذیبی مسائل پر پہنچتی ہے تو اسے حکم ملتا ہے کہ وہ لا الٰہ کے تقاضوں اور اس کے دور رس مطالبات کے پیش نظر ان تمام تہذیبوں سے پرہیز کرے جو اسلام سے ٹکراتی ہوں، اور الا اللہ کو سامنے رکھ کر ایجابی اور مثبت طور پر اس اسلامی تہذیب کو فروغ دے جس کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے۔ جس حدیث میں غیر مسلموں کی مشابہت سے صراحۃً روکا گیا ہے، اس پر تمام علمائے اسلام متفق ہیں، اور بہت سے علماء کی طرح شارح "مشکاۃ" علامہ طیبیؒ کہتے ہیں کہ اس سے تہذیبی اور اخلاقی ہر قسم کی مشابہت ممنوع کی گئی ہے، اور صاحب "مرقاۃ" ملا علی قاریؒ نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ جب ظاہری مشابہت سے روک دیا گیا تو اخلاقی مشابہت تو بدرجۂ اولیٰ ممنوع ہو گئی۔

اس مسئلہ پر محدث دمیاطی کی ایک کتاب ہے مگر وہ تقریباً نایاب ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ غالباً پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس مسئلہ پر بالاستقلال لکھا ہے، اور اس کو اسلام کے

اصل الاصول کے طور پر پیش کیا ہے، اور اس بحث میں بھی دوسرے مباحث کی طرح انکا انداز مجتہدانہ ہے ـــــ غیر اسلامی تقریبات اور دوسری بدعات کا تعلق بظاہر مسئلہ تشبہ سے دور کا معلوم ہوتا ہے لیکن اصلاً ایسا نہیں، بدعت مشابہت ہی کا ایک دوسرا رخ ہے، شیخ الاسلامؒ کے دقیقہ رس ذہن اور گہری نگاہ نے ان دونوں کے تعلق کو دیکھ کر دونوں ہی پر مدلل بحث کی اور اس ضمن میں ان تمام ... فتنوں کی نشاندہی کردی جو اسلامی تہذیب کے لئے کسی درجہ میں خطرہ اور اس میں مداخلت بن سکتے ہیں، شیخ الاسلامؒ کے عہد تک عربی طرزِ تصنیف کا خاصا ارتقا ہو چکا تھا، اور وہ اپنے عہد کے ایک صاحبِ طرز اسلامی مصنف سمجھے جاتے ہیں، تاہم حضرت شیخ کے ہاں جب نئے مضامین اور خیالات کی آمد ہوتی ہے تو کہیں کہیں سلسلۂ گفتگو باقی نہیں رہتا، اور گل افشانئ گفتار کا عالم پیدا ہو جاتا ہے، مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے تھے کہ "ابن تیمیہؒ کے مباحث کا سیلِ جرار دیکھ کر میں سہم جاتا ہوں" ـــــ ایسے موقع پر جدید طرزِ تحریر کے عادی ناظرین شاید کچھ بے ربطی محسوس کریں، لیکن میں نے شیخ الاسلامؒ ہی کی ترتیب کو باقی رکھنے کی کوشش ضروری سمجھی، شیخ نے جس طرح عالم اسلام میں کتاب و سنت کی اتباع کے لئے ذہن پیدا کیا وہ خود اس کا نمونہ بھی تھے، اور ان کے اس طرز تحریر کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بھی انھوں نے "کتاب مبین" ہی کا طرز اختیار کیا جو مضامین کے ظاہری تسلسل کو اتنا ضروری نہیں سمجھتا جتنا اپنے مخاطب کی ضروریات و مسائل کو۔

جہاں تک اقتضاء الصراط المستقیم کی اہمیت کا معاملہ ہے، وہ علماء میں مسلّم رہی ہے، شیخ ابو زہرہ بھی اسے اہم سمجھتے ہیں[1]، مولانا علی میاں صاحب مدظلہٗ شیخ الاسلامؒ کی

---

[1] حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (اردو)، ۴۷،

تصنیفی خصوصیات کے بارے میں فرماتے ہیں" ان کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کتابوں میں زندگی نظر آتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کتابیں کسی علمی گوشہ یا الگ تھلگ جزیرہ میں نہیں لکھی گئی ہیں، بلکہ عین زندگی کے میدان اور عوام کے بیچ میں لکھی گئی ہیں، ان کی کتابوں سے آسانی کے ساتھ ان کے زمانے کا تعین کیا جاسکتا ہے اور اس سوسائٹی کے ذہن واخلاق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جس سے ان کا مصنف متعلق تھا (نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو" اقتضاء الصراط المستقیم")[۱] دوسری جگہ لکھتے ہیں، "ان کی متعدد تصنیفات ایسی ہیں جو ان کے مجتہدانہ فکر ونظر، ذہن رسا، اور قوت تنقید کی شاہد ہیں علاوہ ہر عہد کے دماغوں کو جدید وصالح علمی وفکری غذا مہیا کرتی ہیں، اور ہر زمانہ کے اہل علم کو ان میں نیا مواد، نئے دلائل، اور نئی تحقیقات نظر آتی ہیں، مثال کے طور پر کتاب النبوات، الرد علی المنطقیین، اقتضاء الصراط المستقیم، نہ صرف اعلیٰ علمی تصنیفات اور اپنے موضوع پر کامیاب کتابیں ہیں، بلکہ اس طرح کی خیال آفریں وخیال افروز کتابیں ہیں، جو ذہن کو سوچنے پر آمادہ کرتی ہیں، اور ان کے سامنے نئے علمی میدان اور سوچنے اور غور کرنے کے لئے نئے مسائل اور مضامین لاتی ہیں" مزید لکھتے ہیں" اقتضاء الصراط المستقیم کا موضوع اگرچہ صرف یہ ہے کہ غیر مسلموں کے رسوم وشعائر نہ اختیار کئے جائیں اور ان کی مذہبی تقریبات اور تہواروں میں شرکت نہ کیجائے، مگر حسب معمول یہ کتاب بڑے نفیس مباحث وعلوم پر مشتمل ہے، اور شیخ الاسلام کی بہترین تصنیفات میں شمار ہونے کے قابل ہے"[۲]

پروفیسر محمد یوسف کوکن مدراسی لکھتے ہیں کہ "امام موصوف نے اس کتاب میں اہل کتاب اور کفار ومشرکین کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے اور ان کے رسوم وبدعات میں

---

[۱] تاریخ دعوت وعزیمت" ۲/۴۷-۴۶ ۲۴۸ [۲] ایضاً۔ ۲۴۸

شرکت کرنے کی ممانعت پر کتاب وسنت اور اجماع سلف سے ایک مدلل تفصیلی بحث کی ہے، اس کتاب سے امام موصوف کے زمانے کے مسلمانوں کی طرزِ معاشرت پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔"[1]

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (اردو) سے ترجمہ مکمل ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ کئی سال پہلے مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم بھی اس کی تلخیص "صراطِ مستقیم" کے نام سے شائع کر چکے تھے، مگر وہ عرصہ ہوا کہ نایاب ہے اور شاید پاکستان ہی میں کہیں مل سکتی ہوگی اور ویسے بھی دو تلخیصوں کا ایک جیسا ہونا ضروری نہیں۔

اقتضاء الصراط المستقیم کے ترجمہ اور تلخیص کے بعد بعض مشکل لغات کی تحقیق کے سلسلہ میں مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی[2] سے ملا تو موصوف سے معلوم ہوا کہ وہ بھی اس کتاب کا ایک ثلث ترجمہ کر چکے تھے۔ مجھے پہلے معلوم ہوتا تو ان کے ترجمے کو شامل کتاب کر لیتا، بہر حال بعض الفاظ کے سلسلے میں مولانا مرحوم سے مدد ملی۔ دوسری بات یہ کہ اقتضاء الصراط میں کافی اختصار سے کام لیا گیا ہے لیکن اس میں مکرر آیات واحادیث ہی چھوٹی ہیں، مصنف کی کوئی اہم عبارت چھوٹنے نہیں پائی ہے، اور پھر یہ کہ اس میں مسئلہ تشبہ کے علاوہ بدعت کا بھی بیان آگیا تھا جو دراصل مشابہت ہی کی ایک شکل ہے اس لئے بھی اور کتاب کے مکمل ترجمہ کی حیثیت سے بھی ان مباحث کو بھی سمیٹ لیا گیا، اقتضاء الصراط میں متن کتاب میں بھی مترجم کی عبارتیں ہیں جو عمودین کے اندر ہیں۔

اس ترجمہ پر مخدومی مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی مدظلہ کے گراں قدر مقدمہ کے لئے میں صمیم قلب سے ممنون ہوں اس مقدمہ کے لئے حضرت مولانا سے بڑھ کر

---

[1] امام ابن تیمیہ، ۶۴۷

[2] افسوس کہ مولانا موصوف کا کتاب کی اشاعت سے پہلے جولائی ۷۱ء میں انتقال ہو گیا

کوئی دوسرا حقدار نہ تھا، اس لئے کہ شیخ الاسلامؒ کے علوم و معارف اور ذوق و وجدان سے انھیں جو شغف ہے، وہ عالم اسلام کے چند ہی افراد کے ہاں ملتا ہے۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

۲۷ر شعبان المعظم ۱۳۹۰ھ
۲۹ر نومبر ۱۹۷۰ء

شمس تبریز خاں
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

باب اوّل

اسلام اور مسئلۂ تشبّہ

امّا بعد! مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے خود سے یا کسی کے جواب میں کفار کی عیدوں کی مشابہت سے منع کیا تھا اور قدیم تاریخ و شرعی دلائل کی روشنی میں اس سے بحث کی تھی، اور غیر مسلموں کی سیرت سے اجتناب میں شریعت کی مصلحت پر لکھا تھا، اگرچہ یہ شریعت کا ایک عظیم قاعدہ اور دستور تھا اور ایک اصل جامع کا حکم رکھتا تھا لیکن میں نے اس سلسلے میں تفصیل پسند کی تھی جو مجھے اب یاد نہیں رہی۔

پھر بعد میں مجھے علم ہوا کہ بعض لوگوں نے اسے اپنے موروثی عادات و رسوم کے خلاف پاکر اس پر حیرت کا اظہار کیا تھا اور اس سلسلے میں عمومی اور مطلق باتوں کا سہارا لیا، اس پر مجھ سے بعض احباب نے تقاضا کیا کہ میں اصل مسئلے پر کچھ لکھوں اس لئے کہ اس سے بڑے فائدے اور نفع کی توقع ہے، اس مشابہت نے اس حد تک وبائے عام کی شکل اختیار

کرتی ہے کہ لوگ دوبارہ جاہلیت کے گرفتار نظر آ رہے ہیں، چنانچہ میں نے اس مسئلہ پر لکھا تاہم اگر میں اس سلسلے کے تمام دلائل اور علماء کے اقوال کا احاطہ کرتا تو گفتگو اور طویل ہو جاتی۔

مجھے ان لوگوں کی حیرت سے پہلے یہ گمان نہیں تھا کہ جو فقہ پر نظر رکھتا اور شریعت کے اشارات و مقاصد کو سمجھتا ہے اور فقہا کے استدلال اور ان کے بیانات کو بھی جانتا ہے، اس مسئلہ میں شک کرے گا، مجھے یہ بھی شبہ نہیں تھا کہ (ایمان جس دل میں گھر کر چکا ہو، اور حقیقت اسلام جس میں اتر چکی ہو اور جس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہو کہ اسلام کے سوا خدا کو کوئی دین مطلوب نہیں) جب اس نکتہ پر متنبہ کیا جائے گا تو اس سے اس کے قلب کی زندگی اور ایمان کی تازگی کا سامان نہ ہو گا لیکن دلوں کے زنگ اور طبیعتوں کے فساد کا برا ہو کہ وہ حق کی معرفت اور اس کی اتباع سے ہمیشہ روکتے ہیں۔

بعثت محمدی سے پہلے دنیا کی حالت

آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت لوگ دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے، یا تو اہل کتاب تھے (جو کسی کتاب کے منسوخ یا موضوع حصے کو پکڑے ہوئے یا کسی فرسودہ مذہب کے پیرو تھے) یا پھر عرب و عجم کے امی اور ناخواندہ عوام تھے، جو اپنے طور پر ستاروں، بتوں، قبروں یا مجسموں کی پوجا کر رہے تھے، لوگ علم کے نام پر جہالت اور صلاح کے عنوان سے فساد کو اپنائے ہوئے تھے، اس وقت کے ذہین لوگ بھی مذہب اور بدعت کے اس آمیزے کو سینے سے لگائے ہوئے، اور اپنے علم و عمل کا محور بنائے ہوئے تھے، یا کچھ لوگ فلسفہ، طبعیات، ریاضیات اور اخلاقی مباحث میں اپنی جان کھپا رہے تھے لیکن اس کے نتیجہ میں مفید اور ربانی علم سے دور ہی ہوتے چلے جا رہے تھے، اور مذاہب فلسفہ کے

اختلافات کی وجہ سے حق کا شاید ہی کوئی حصہ ان کے ہاتھ آتا تھا۔

اس موقع پر اللہ تعالےٰ نے نبوت محمدی کی برکت سے لوگوں کی ہدایت کی اور بینات وہدایات کے ذریعہ علم نافع، عمل صالح، اخلاقِ فاضلہ، اور صالح اقدار کا ایسا سامان ہوا کہ تمام عالم کی حکمتوں اور پسندیدہ نظریوں کو اس سے کوئی نسبت ہی نہ تھی پھر اللہ تعالےٰ نے واضح کردیا کہ اسلام ہی صراطِ مستقیم ہے اور ہر نماز میں اس پر جمے رہنے کی دعا کی تلقین فرمائی، اور یہ بھی بتایا کہ یہ راستہ مغضوب اور گمراہ قوموں کے راستے سے الگ ہے۔

یہود کی مغضوبیت اور نصاریٰ کی ضلالت

ان دونوں مسائل پر علمائے امت کا تقریباً اجماع ہے کہ "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" کے مصداق یہود ونصاریٰ ہیں، حضرت عدی بن حاتمؓ فرماتے ہیں کہ "میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بلا کسی امان کے (اس لئے کہ یہ رکوی تھے) حاضر ہوا۔ لوگوں نے میرا تعارف کرایا تو آپؐ نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ یہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدے گا۔ ختمِ مجلس پر آپؐ مجھے اپنے ساتھ لے کر چلنے لگے کہ ایک خاتون اور اس کے بچہ نے سامنے آکر اپنی حاجت پیش کی آپ نے ان کی حاجت روائی کی اور مجھے دولت خانہ پر لے گئے وہاں پہونچ کر آپ نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں اسلام سے کیا چیز روکتی ہے؟ کیا خدا کے سوا کوئی معبود ہے؟ میں نے کہا نہیں پھر آپؐ نے فرمایا کہ تم خدا کی عظمت تسلیم کرنا نہیں چاہتے؟ میں نے کہا ایسا بھی نہیں پھر آپؐ نے فرمایا کہ یہود مغضوب اور نصاریٰ گمراہ ہیں، اس پر میں نے کہا کہ میں تو مسلم کامل ہوں،

وہ کہتے ہیں کہ یہ سن کر روئے اقدس گلِ تر کی طرح شگفتہ ہو گیا۔ (ترمذی)

قرآن کی آیت "قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُم بِشَرٍّ مِّن ذَٰلِكَ مَثُوبَةً عِندَ اللَّهِ مَن لَّعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ" (۵: ۶۰) اس میں یہود ہی سے خطاب ہے اور ضمیر انہی کی طرف راجع ہے، اسی طرح "أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِم مَّا هُم مِّنكُمْ وَلَا مِنْهُمْ" (۵۸: ۱۴) کے بارے میں مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ منافقین کے بارے میں ہے، جو یہود کی دوستی کا دم بھرتے تھے۔

تیسری آیت میں کہا گیا ہے "ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ" (۳: ۱۱۲) اسی طرح آیات (۲: ۶۱، ۲: ۹۰) سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدائی غضب کے شکار رہیں۔

نصاریٰ کے بارے میں آیا کہ "وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِن قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ" (۵: ۷۷)۔ یہود حق سے پہلوتہی کرنے کی وجہ سے مورد عتاب ہوئے اور نصاریٰ غلو اور خودرائی سے مستحق عذاب۔

یہود کے کفر کا بڑا سبب ان کی بدعملی ہے یعنی علم رکھتے ہوئے (اور ایک زمانہ میں توحید کے علمبردار ہوتے ہوئے بھی) توحید کے تقاضوں سے گریز اُن کے کفر کا سبب ہے، اور نصاریٰ کا کفر عمل بلا علم کے سبب سے ہے، اس لئے کہ عبادات اور عقائد میں انہوں نے وحی الٰہی کے بغیر من مانی کی، اسی لئے سفیان بن عیینہ فرماتے تھے کہ "علماء سوء یہود کے مشابہ اور عابد جاہل نصاریٰ کی نظیر ہے۔" افسوس ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی ہے کہ ہم یہود و نصاریٰ کی قدم بقدم پیروی کریں گے حتیٰ کہ وہ کسی مہلک غار میں گھسیں گے تو ہم بھی ان کے پیچھے ہوں گے صحیحین میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ لتتبعن

سنن من کان قبلکم حذو القذة بالقذة حتی لو دخلوا جحر ضب لدخلتموہ، قالوا: یارسول اللہ! الیھود والنصاریٰ؟ قال: فمن؟
اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: "میری امت روم وفارس کی اتباع کرے گی" لاتقوم الساعة حتی تأخذ أمتی ماخذ القرون شبرًا بشبر وذراعًا بذراع فقیل یارسول اللہ، کفارس والروم؟ قال ومن الناس الا اولئك؟" اور یہ تقلید جس درجہ میں ہوگی اسی کے اعتبار سے کفر وفسق اور گناہ کا حکم لگایا جائے گا، یہاں میں چند صورتوں کی طرف اشارہ کروں گا جن میں مسلمانوں نے اہل کتاب اور عجم کی تقلید کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اہلِ کتاب کی خواہش ہے کہ ایمان کے بعد تم دوبارہ کفر میں آجاؤ، یہ محض حسد کی وجہ سے ہے حالانکہ حق ان پر کھل چکا ہے۔" (۲:۱۵۹) اس معاملے میں بعض مسلمان ایک دوسرے کے علم وعمل پر حسد کرتے ہیں، اور زوالِ نعمت چاہتے ہیں، جو یہود کی تقلید ہے۔

آیت مبارکہ ہے "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَیَکْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ" (۴:۳۶-۳۷) (یعنی اللہ مغرور اور شیخی باز کو پسند نہیں کرتا اور نہ ان لوگوں کو جو بخل کرتے بھی ہیں اور دوسروں کو اس کی تاکید بھی کرتے ہیں، اور اللہ کے انعام کو چھپاتے ہیں) اس میں بخلِ علمی اور مالی دونوں کی طرف اشارہ ہے لیکن کتمانِ علم اور علمی بخل کے اشارات دوسری آیتوں میں بھی ہیں، جہاں یہودیوں کی اس صفت کو بتایا گیا ہے، ملاحظہ ہو:

آیات ۳: ۱۸۷، ۲: ۱۵۹۔ ۲: ۱۷۴۔

ان آیات میں بتایا گیا کہ یہود کبھی علم کو بخل کی وجہ سے چھپاتے ہیں کبھی حرصِ دنیا کے تحت، اور کبھی اپنے دوسرے مصالح کے ماتحت، یہی حال ان مسلم علماء کا بھی ہوگا، جو ان مقاصد کے پیش نظر کتمانِ علم کو روا رکھتے ہیں، عبدالرحمٰن بن مہدی کا کہنا تھا کہ اہلِ علم اپنے خلاف بھی لکھنے کی جرأت کر سکتے ہیں، لیکن اہلِ ہوس اپنے مفاد کے سوا کچھ نہیں لکھ سکتے۔

آیت کریمہ ہے: "وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا" (۲: ۹۱) (یعنی ایمان کے مطالبہ پر وہ کہتے ہیں کہ ہمارا دین کافی ہے) آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہود کبھی علم کو بخل کی وجہ سے چھپاتے ہیں اور کبھی حرص دنیا سے، یہودی بعثت سے پہلے نبی موعود کے منتظر تھے، مگر جب وہ ان کی قوم سے نہیں ہوا تو سرے سے اس کے منکر ہو گئے، کچھ یہی حال ہماری ملت کے تحزب، اجماعتی عصبیت اور گروہ بندیوں کا ہے علم و دین، شریعت و طریقت کے مختلف دائرے بن گئے ہیں جن میں لوگوں نے حق کو محدود و محصور سمجھ رکھا ہے، حالانکہ ہمارے لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی مطاع نہیں۔

آیت شریف ہے "مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ" (۴: ۴۶) اور "يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ" (۳: ۷۸) اس میں تحریف تنزیل اور تحریف تاویل دونوں کی طرف اشارہ معلوم ہوا۔

تحریف تاویلی تو اس امت میں بہت ہوئی ہے، اور تحریف تنزیلی کی یہ صورت

ہے کہ احادیث میں الفاظ گھٹائے بڑھائے جائیں ضعیف اور منکر روایات بیان کی جائیں، یہاں تک تو یہود کے بارے میں تھا، نصاریٰ کے متعلق ارشاد ہوا۔
"يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ" (۴: ۱۷۱) یعنی دین میں غلو نہ کرو اور حق تعالیٰ کے بارے میں حق ہی کہو دین میں غلو کا ایک پہلو انبیاء اور اولیاء کے ساتھ غلو بھی ہے، جس میں خدائی روح کا حلول اور اتحاد مان لیا جاتا ہے (اور احمد و احد کے درمیان سے پردہ میم کو اٹھا دینے کی کوشش ناروا کی جاتی ہے)

ارشاد ہے: اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ (۹: ۳۱)

یہ عیسائیوں کے بارے میں کہا گیا، لیکن خود امت مسلمہ کا بھی یہ حال ہوا کہ پیروں، صوفیوں اور اپنے رہنماؤں کے ماتحت ہو کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر لیتے ہیں۔

ضلالت کا سبب دین میں غلو

اللہ تعالیٰ نے دین میں غلو کرنے والوں کے متعلق فرمایا: "وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ" (۵۷: ۲۷) (انھوں نے رہبانیت تراش لی ہم نے تو ان پر خدا کی رضا طلبی فرض کی تھی) ایسے لوگوں کے دین کا ماحصل خوش گلوئی اور مقامات کی آرائش کے سوا کچھ نہیں ہوتا، بدعتی صوفیہ بھی اسی کا ارتکاب کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اہل باطل کی پہچان بتائی ہے کہ وہ ایک دوسرے

کی تردید کرتے ہیں، جیسے مسیحی اور یہودی ایک دوسرے کی تردید کرتے تھے، ویسے ہی ایسے فقہا، صوفیا کو کچھ نہیں سمجھتے اور اس قسم کے صوفیا فقہا کی شریعت کو ظاہری قرار دیتے ہیں، جہاں تک روم اور ایران کی مشابہت کا خیال ہے تو یہ مسلمانوں کے قول وعمل میں جس طرح داخل ہو گئی ہے وہ ظاہر ہے ——— یہاں پھر سوال ہے کہ صراط مستقیم کیا ہے تو اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ صراط مستقیم کا تعلق قلب کے عقیدہ اور ارادہ سے اور ظاہری عبادات وعادات اور عام زندگی میں انسان کے رویے سے ہے، اور ان ظاہری و باطنی امور میں ایک ربط باہم پایا جاتا ہے، اس لئے کہ ظاہر و باطن اور قلب و ذہن کا ایک دوسرے پر اثر اور ردعمل برابر مرتب ہوتا رہتا ہے، آنحضرتؐ کی بعثت اسی لئے ہوئی کہ وہ مغضوب وضالین کے طریقوں اور ان کی مشابہتوں سے لوگوں کو بچائیں ——— اس تشبہ کی خرابیوں پر لوگوں کی نگاہ عموماً نہیں جاتی، عدم تشبہ میں ایک حکمت یہ ہے کہ کسی قوم سے تشبہ کے بعد اس کی خرابیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور اس کی طرف عام میلان پیدا ہو جاتا ہے، جیسے علماء کا لباس پہننے والا اپنے میں ان کی طرف ایک میلان محسوس کرتا ہے، یا فوجی لباس کا استعمال کرنے والا فوجیوں کے اخلاق کی طرف جھکا ہوتا ہے، اور کوئی رکاوٹ ان لوگوں کو نہ ہو تو وہ مکمل مشابہت اختیار کر لیتے ہیں، دوسرے یہ کہ غیر مسلمین سے عدم مشابہت اہل حق کی طرف میلان کا باعث ہو جاتی ہے، اور جب کسی کے پاس دلِ زندہ ہو اور وہ اسلام کا حقیقی عرفان بھی رکھتا ہو ——— صرف ظاہری اور تقلیدی ہی نہ ہو ——— تو وہ اہل باطل سے دوری اور ان کے اخلاق سے پرہیز میں بھی بہت ثابت قدم ہو گا۔

ایک اور مصلحت یہ ہے کہ غیر مسلموں سے ظاہری مشابہت کے بعد حق و باطل کی تمیز اور قومی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے، یہ تو صرف مباح امور میں تشبہ کا حکم ہے ورنہ اگر موجبات کفر اور اعمال کفر میں مشابہت ہے تو وہ سبب کفر بھی بن سکتی ہے۔

ارشاد ربانی ہے: "إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ" (۶: ۱۶۰)

(جن لوگوں نے اپنے دین میں تفریق پیدا کی اور گروہوں میں بٹ گئے آپ ان کی کسی بات کے ذمہ دار نہیں ان کا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے وہ ان کے فعل کی خبر دے گا)

ظاہر ہے کہ تفریق فی الدین کافرین ہی کا کام ہے جیسا کہ ارشاد ہوا: "وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ" (۳: ۱۰۵) آیات نمبر ۹: ۴، ۵: ۱۴، اور ۵: ۶۴ میں بھی یہی کہا گیا۔

آیت بالا میں لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ کہہ کر بتا دیا گیا کہ آپ کو ان سے مکمل بائیکاٹ کرنے کا حکم ہے اور پھر آپ کے واسطے سے امت کو بھی یہی حکم ملا ہے، اس صورت حال کے پیش نظر ایک کا وصال دوسرے سے انفصال کا اور ایک کا قرب دوسرے سے بعد کا مرادف ہے؛

سارت مشرقة وسرت مغربا

وشتان بين مشرق ومغرب

آیت کریمہ ہے: "لِّلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ اللَّهُ فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ" (۲: ۲۸۴-۲۸۵) جو کچھ زمین وآسمان میں ہے خدا کا ہے، تمہارے دل میں جو ہے اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ اس کا حساب لے سکتا ہے پھر جسے چاہے بخشدے اور جسے چاہے، عذاب دے اللہ ہر شے پر قادر ہے، یہ رسول اپنے رب کی وحی پر ایمان لاتے ہیں، اور مومنین بھی، یہ سب اللہ، ملائکہ اس کی کتابوں اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں (اور وہ کہتے ہیں) کہ ہم رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے، اور کہتے ہیں کہ ہم سنتے اور اطاعت کرتے ہیں اور آپ کی مغفرت چاہتے ہیں، اور آپ ہی کی طرف جانا ہے۔"

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری تو حضرات صحابہ فکرمند ہو کر نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عرض رسا ہوئے کہ حضورؐ ہم عبادات اربعہ کی طاقت رکھتے ہیں لیکن اس آیت کی تاب ہم نہیں لاسکتے، آپ نے فرمایا کہ کیا تم اہل کتاب کی طرح یہ کہنا چاہتے ہو کہ "سمعنا وعصینا" بلکہ "سمعنا واطعنا" کہو۔ پھر صحابہ نے جب سمع وطاعت کا مظاہرہ فرمایا تو اس سے آگے کی آیتیں اتریں جن میں تکلیف مالا یطاق، آصار واغلال، اور ان مشقتوں کے ختم کر دینے کا اعلان ہوا جو اگلی امتوں میں تھیں۔

"لا رہبانیۃ فی الاسلام" کہہ کر آپؐ نے اہل کتاب اور دوسرے اہل مذاہب کی دنیا بیزاری اور غلط دینداری کا خاتمہ کر دیا، اور ان انتہا پسندیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ترک دنیا اہل کتاب کے آثار میں سے ہے "فتلك بقایاھم فی الصوامع"

ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ" (۵:۵۱) (اے اہل ایمان یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ بلکہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو ان سے دوستی کا دم بھرے گا وہ انہی میں سے ہوگا)

دوسری آیت میں کہا گیا: أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِم مَّا هُم مِّنكُمْ وَلَا مِنْهُمْ" (۵۸:۱۴) (کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا جو خدا کی معتوب قوم سے دوستی کرتے ہیں، حالانکہ نہ وہ ان میں سے ہیں نہ یہ ان میں سے)

اسی مفہوم کو آیات (۵۸:۲۲-۸:۷۲، ۵:۵۷-۵:۵۵) میں بیان کیا گیا کہ کفر و اسلام کی دوستی کا کوئی مطلب نہیں۔

ظاہری تشبہ کے بارے میں ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہ کسی قسم کی مودت و موالات کا ذریعہ نہیں تو اس کے ترک میں کوئی مصلحت نہیں، لیکن یہ بھی بہر حال ایک طرح کا تقرب ہے، جیسا کہ عادت و طبیعت کا تقاضا ہے، اسی لئے سلف نے حکومت کے شعبوں میں ان سے استعانت کو غلط کہا ہے، امام احمد نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ میں نے ایک نصرانی سکریٹری رکھ لیا ہے آپ نے خفا ہو کر فرمایا کہ کوئی مسلمان نہیں ملا تھا، انھوں نے جواب دیا، اس کا دین اس کے پاس، مجھے تو اس کے کام سے کام ہے۔ (لی کتابتہ ولہ دینہ)۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ جب خدا نے ان کو ذلیل و محروم کیا ہے تو میں انھیں معزز اور مقرب نہیں بنا سکتا

• لا اکرمهم اذا اهانهم الله ولا أعزهم اذا اذلهم الله ولا ادنیهم اذا اقصاهم الله[1]

[1] لیکن احناف اور عام علماء اسے جائز بھی کہتے ہیں اگرچہ مستحسن نہیں سرخسی لکھتے ہیں الاستعانة بالمشركين في الجهاد جائز ولكنه قال انه بمنزلة الاستعانة بالكلاب (شرح سیر کبیر ۱/۲۶۳) نیز ۳/۲۴۱ پر بھی لکھے جو ذکر کیا ہے

صحیحین میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے حضورؐ نے فرمایا "ان الیھود والنصاریٰ لا یصبغون فخالفوھم" یہود و نصاریٰ خضاب استعمال نہیں کرتے تم استعمال کرکے ان کی مخالفت کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کا مقصد یہ بھی ہے کہ دوسری شریعتوں کے مقابلے پر اپنا امتیاز قائم کرے۔

اسلام اور قدروں کا کامل تصور

(اسلام چونکہ آخری صداقت اور انسانیت کے لئے مکمل نعمت ہے اس لئے اس میں زندگی کی قدروں اور خوب و ناخوب کا تصور اور معیار بہت واضح، مکمل اور دو ٹوک ہے، وہ فلسفہ نہیں کہ چھوٹی موٹی سچائیوں کی اپیل کرے، اسے انسان بنانا اور ڈھالنا ہے اس لئے وہ زندگی کے لئے بنے بنائے سانچے دیتا ہے، اسے زندگی کے قافلے کی رہنمائی کرنا ہے اس لئے راستہ کے تمام اتار چڑھاؤ کو پہلے ہی بتا دیتا ہے)۔۔۔۔۔ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ اسلام جب کوئی حکم دیتا یا جہاں منع کرتا ہے تو صرف اس مخصوص و متعین امر و نہی کو نہیں سامنے رکھتا، بلکہ اس اچھائی اور برائی کے سرچشمہ اور اس کے پورے سلسلہ کو قبول یا رد کرنا چاہتا ہے۔

جیسے جب وہ کہتا ہے کہ .... "وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ" ۱۹۵:۲ ۔۔۔۔۔۔ اور اچھا کام کرو کہ اللہ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے، ۔۔۔۔۔ یا "اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ" ۷:۵۷ ۔ اللہ رسول پر ایمان لاؤ، یا "اُعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ" ۵:۷۲ اس خدا کو پوجو جو میرا اور تمہارا رب ہے، ۔۔۔۔۔ یا "فَعَلَیْہِ تَوَکَّلُوْا" ۸۴:۱۰ ۔۔۔ اللہ ہی پر بھروسہ کرو، تو ان تمام

آیتوں میں تقویٰ، احسان و ایمان، عبادت و توکل کی تعلیم دی گئی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اچھائی کی کل یہی شکلیں ہیں بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اچھائیاں بھی اپناؤ اور دوسری وہ تمام اچھائیاں اور عالمی سچائیاں بھی اختیار کرو جو اسلام میں ہیں یا اسلام جن کی تردید نہیں کرتا۔

اس لئے اگر کسی متعین برائی میں کسی شخص کو مبتلا دیکھ کر اسے خوفِ خدا کے لئے کہا جائے اور تقویٰ کی تعلیم دی جائے تو اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ اس برائی سے رُک جائے بلکہ اس کے ساتھ دوسری برائیوں سے گریز و پرہیز بھی اس میں شامل ہے۔ اس تمہید کے بعد ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ جہاں یہود و نصاریٰ، مشرکین یا دوسری قوموں سے ترک تشبہ کے لئے کسی خاص چیز کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے تو اس کا مطلب اس خاص شے ہی تک محدود نہیں بلکہ اس کا کھلا مفہوم یہ ہے کہ ہر غیر اسلامی شعار اور شعائر سے بچنا اور بھاگنا اسلام کو مطلوب ہے "لان الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوص الذکر" عام مفہوم کا اعتبار ہے نہ کہ مخصوص الفاظ کا ــــ پھر عموم کا جو مفہوم بھی لیا جائے اس میں کلیت داخل ہے، یعنی اگر مخالفتِ کفار و مشرکین کا عام حکم ہے، اور ان کے تشبہ سے عام طور پر منع کیا گیا ہے تو یہ حکم صرف چند معاملات میں مخالفت، یا ترک تشبہ سے نہیں پورا ہو جائے گا بلکہ اس کے پورے تقاضوں پر عمل ضروری ہے، جیسے چند پھولوں سے گلستاں نہیں بنتا[1] اور ڈیڑھ اینٹ سے مسجد نہیں تعمیر ہو جاتی اسی طرح اللہ کے امر و نہی کی انجام دہی صرف چند باتوں کی تعمیل کر لینے

---

[1] انگریزی مثل ہے۔

سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اپنے کو مکمل طور پر خدا کے حوالے کر دینے سے ہوتی ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ جب شارع علیہ السلام نے ان کی مخالفت کا حکم دیا تو پھر نیت اور عدم نیت، شعور اور بے شعوری کا کوئی فرق نہیں رہ جاتا یعنی ہم مشرکین کے کسی عمل کی موافقت یہ کہہ کر نہیں جائز کہہ سکتے کہ یہ بے اختیاری یا غیر شعوری عمل ہے جس میں ان کے ساتھ تشبہ کے قصد و ارادہ کا دخل نہیں، اس کی ایسی ہی صورت ہے جیسے مریض کو ان تمام چیزوں سے رکنا چاہیے، جو بد پرہیزی میں شمار ہوتی ہیں۔ خواہ ان کے استعمال میں اس کی نیک نیتی ہی کو کیوں نہ دخل ہو۔

وہ کہتے ہیں کہ جہاں کسی وصف کے بعد "فا" کو داخل کر کے کوئی حکم دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ حکم ہی علت ہے، اس لئے یہاں "ان الیھود والنصاریٰ لا یصبغون" کہہ کر "فخالفوھم" کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی مخالفت بھی مقصودِ شریعت ہے، پھر اس کے ساتھ ہی اس فعل میں بھی کوئی زبردست خرابی ہوتی ہے جس سے روکا جاتا ہے کیونکہ ظاہری مشابہت سے "تن" کی خرابی ہوتی ہے، مگر اس فعل کا اثر جو قلب و باطن اور "من" پر پڑتا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ ع

نیست بیماری چو بیماریٔ دل

اسلام میں اگر ظاہری تشبہ اور یکسانیت سے روکا گیا ہے تو یہ کوئی اندھا مخالفانہ جذبہ، یا بغض للّٰہی نہیں اور نہ اس میں کسی قومی اور نسلی احساس برتری اور عصبیت کو دخل ہے بلکہ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ظاہری مناسبت اور موافقت کا اثر ظاہر ہی تک نہیں رہتا بلکہ وہ انسان کے قلب و دل و نگاہ

تک سرایت کر جاتا اور رگ و ریشہ میں پیوست ہو جاتا ہے، اگر کفار و مشرکین سے ظاہری یکرنگی اور ہم آہنگی اپنی جگہ تک محدود رہتی تو شریعت میں ان کی مخالفت کی تعلیم اتنی شدت سے نہ ہوتی، بلکہ یہاں تو اس کا الٹا معاملہ ہے کہ یہ ہم نوائی جہاں ظاہر کو گندہ کرتی ہے وہیں باطن کو بھی آلودہ کر دیتی ہے اور دل کی گندگی اسلام کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی اصلاح کا مرکز دل ہی تو ہے ؂

بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنی
ہمیں ورق کہ سیہ گشت مدعا اینجاست!

شیخ الاسلامؒ نے اس مخالفت کی دوسری وجہ بتائی ہے کہ مشرکین کے ہاں یا تو وہ چیزیں ہیں جن میں کوئی اصلیت اور حقیقت نہیں، یا وہ باتیں ہیں جن کی اصل تو ہے مگر اس کی شکل بگڑی ہوئی ہے، اس لئے اسلام اس میں ترمیم و اضافہ کے بعد ہی رد و قبول کا کوئی اختیار دے گا، پھر دین کامل کے آنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اگلی شریعتیں اور تہذیبیں ناقص تھیں یا بعد میں ان میں نقص پیدا ہو گیا اس لئے کہ اگر وہ آخری سچائی ہوتیں تو پھر نئے دین، نئی کتاب اور نئے رسولؐ کے بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اسی لئے آیا تھا کہ تہذیبوں کو سہارا دے اور ان کے صالح نقوش کو ابھارے، مذاہب کی تجدید و اصلاح کرے، وقت کی مانگ اور زمانے کے تقاضے کو پورا کرے، تاریخ انسانیت کے خلا کو بھر دے، اور فکر و نظر کی خلیج کو پاٹ دے، اس حقیقت کے ماننے کے بعد یہ ماننا ضروری ہے کہ اب کسی مذہب و تہذیب میں زندہ رہنے اور زندگی کو کچھ دینے

کی صلاحیت نہیں ہے اور اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کسی مذہب میں کوئی عالمی صداقت مکمل شکل میں موجود رہ گئی ہے (ولا یتصور ان یکون شئ من امورھم کاملاً قط ۵۷)۔

کفر و شرک کی یہ مخالفت بلاوجہ نہیں ہوگی بلکہ دین و دنیا دونوں ہی کے فائدے اور نفع اس میں ہوں گے حتیٰ کہ جن دنیاوی معاملات میں ان کا پورا یقین ہے یا وہ واقعی ان کے لئے مفید ثابت ہو چکی ہیں ان کا بھی حال یہ ہے کہ وہ ہماری دنیا اور آخرت کے لئے مضر اور نقصان دہ ہو سکتی ہیں، اس لئے مخالفت بہر حال ضروری ہو جاتی ہے۔" وحتی ماھم علیہ من اتقان امور دنیاھم قد یکون مضراً باخرتنا او بما ھو اھم منہ من امر دنیانا ھ ۵۷۔

کفر و شرک مومن کے لئے دل کی بیماری سے کم نہیں اور جب دل ہی بیمار ہو تو پھر جسم کی خیر نہیں اس لئے کہ اگر جڑ سوکھ رہی ہو تو درخت لاکھ ہرا بھرا ہو لیکن کبھی نہ کبھی وہ سوکھ کر رہے گا، یہاں ابن تیمیہؒ اپنی غیر معمولی فراست و دینی بصیرت کے ماتحت ایک بات کہتے ہیں کہ تشبہ سے مخالفت کی علت و حکمت آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں، جب تک کہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور نہ کیا جائے، اور اللہ کی مدد نہ ہو، یہ بات دل میں اترنے والی نہیں، بظاہر تو لوگ یہی کہیں گے کہ یہ مخالفت کا حکم اسی لئے دیا جا رہا ہے تاکہ اسلام کو زبردستی غالب کیا جائے اور سیاسی قوت و شوکت کا مظاہرہ کیا جائے، اپنی بڑائی اور برتری قائم رکھی جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نبوت اور شریعت ملک و سلطنت کی انتہا ہے، لیکن نبوت کی سلطانی اور حکمرانی ہی مومن کا مقصود ہوتی ہے، اسے دنیا کی عزت و حکومت

سے کوئی غرض نہیں ہوتی اسلام چند تصورات کی حکومت چاہتا ہے، خدا کی سلطنت کو پھیلانا چاہتا ہے، نہ کہ انسانوں پر انسانوں کے اقتدار کو ۔

ان کی حکومت سے ہے فاش یہ رمز غریب
سلطنتِ اہل دل فقر ہے، شاہی نہیں،

کفر کی مخالفت، اسلام کا مقصود

امام احمدؒ بھی اس گذشتہ حدیث میں کفر کی مخالفت ہی کو اسلام کا مقصود قرار دیتے ہیں، حنبلؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابو عبد اللہ (امام احمدؒ) کو کہتے سنا کہ میں کسی مسلمان کے سفید بال نہیں دیکھنا چاہتا، حضورؐ نے خضاب کا حکم دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ بالوں کو رنگ دیا کرو، اور اہل کتاب کی مشابہت مت کرو، اسحاق بن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے ابو عبد اللہ کو اپنے والد سے یہ کہتے سنا کہ ایک بار ہی سہی لیکن خضاب کر لو تا کہ یہود کی مشابہت نہ رہے، اس لفظ سے امام احمدؒ نے استدلال کیا ہے، ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "غیّروا الشیب ولا تشبھوا بالیھود" ترمذیؒ نے اسے حدیث حسن صحیح کہا ہے، اور نسائیؒ نے حضرت زبیرؓ سے یہی روایت کی ہے اور عبد اللہ بن عمرؓ سے بھی اس کی تائیدی روایت نقل کی ہے لیکن لکھا ہے کہ حدیثیں محفوظ نہیں، دار قطنی کہتے ہیں کہ عروہ کی یہ روایت مرسل مشہور ہے۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں اسلام کے اس مزاج TEMPERAMENT ہی کا اظہار صفائی سے ہوا ہے، اس لئے کہ بڑھاپے اور بالوں کی سفیدی میں انسانوں کا

کوئی دخل نہیں لیکن جب اس میں بھی غیروں کی مشابہت سے منع کر دیا گیا تو جن چیزوں میں اپنے اختیار اور پسند کو دخل ہے ان میں تو اور زیادہ مشابہت سے رکنا اور بچنا ہوگا۔

صحیحین میں اس کی دوسری مثال ابن عمرؓ کی حدیث ہے "خالفوا المشرکین احفوا الشوارب واعفوا اللحیٰ" (مشرکین کی مخالفت کرو مونچھیں کترواؤ اور داڑھیاں بڑھاؤ) یہاں پہلے مشرکین کی مطلق اور کھلی ہوئی مخالفت کا حکم دیا گیا، اس کے بعد اس کا ایک طریقہ بھی بتایا گیا ———— مسلم کی حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے "جزّوا الشوارب وارخوا اللحی خالفوا المجوس" (مونچھیں کترواؤ اور داڑھیاں بڑھاؤ اور مجوس کی مخالفت کرو)۔

مروزی کہتے ہیں، میں نے امام احمدؒ سے پوچھا کہ سر کا اگلا یا پچھلا حصہ کتروانا یا مونڈانا کیا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ یہ مجوس کا فعل ہے اور جو ان کی مشابہت اختیار کرے گا تو انہی میں سے ہوگا، دوسری بار سوال پر آپ نے قتادہ کی ایک مرسل روایت ذکر کی "ان حلق القفا من فعل المجوس" (بابری بنانا مجوس کا فعل ہے) ابن منصور کی روایت ہے کہ میں نے اس بارے میں پوچھا تو امام احمدؒ نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے ابراہیم کی روایت کا حوالہ دیا جس میں کراہت کا ذکر ہے۔

ہثیم ابن حمید سے آپ نے روایت کی ہے "حلق القفا من شکل المجوس" (گردن کے بال بنوانا مجوس کی عادت ہے) معمر بن سلیمان تیمی کہتے تھے کہ میرے والد جب سر کے بال بنواتے تو پھر گردن کے بالوں کو منڈاتے نہیں تھے، وہ اسے عجم سے تشبہ قرار دیتے تھے۔

شداد ابن اوسؓ کی روایت میں حضورؐ نے فرمایا "خالفوا الیھود فانھم لایصلون فی نعالھم ولاخفافھم" (ابوداؤد) یعنی یہود کی مخالفت کرو وہ جوتوں اور موزوں کو پہنے ہوئے نماز نہیں پڑھتے، خیال رہے کہ یہ حکم اس خدائی حکم کے باوجود دیا جارہا ہے، جو حضرت موسیٰؑ کو وادئ ایمن میں ملا تھا کہ جوتے اتار کر آیئے "فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ" (۱۲:۲۰)[1]

حضرت عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں، حضورؐ نے فرمایا "فَصْلُ مَا بَیْنَ صِیَامِنَا وصِیَامِ اھلِ الکتابِ: اکلۃ السَّحرِ" (مسلم) یعنی اہل کتاب کے اور ہمارے روزوں میں فرق یہ ہے کہ ہم سحری کھاتے ہیں اور وہ نہیں کھاتے، اس سے معلوم ہوا کہ سحری کی تعلیم اور تاکید سے دونوں قوموں کے طرزِ عبادت میں فرق کرنا مقصود تھا

ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں حضورؐ کا ارشاد ہے "لایزال الدِّین ظاھراً ما عجَّل الناس الفطرَ لان الیھود والنصاریٰ یؤخرون" (یعنی دین اس وقت تک غالب رہے گا جب تک مسلمان افطار میں جلدی کرتے رہیں گے، اس لئے کہ یہود و نصاریٰ اسے مؤخر کرتے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ غلبۂ دین، اہل کتاب کی مخالفت ہی کے بعد حاصل ہوگا، اور جب غلبۂ دین انکی مخالفت سے حاصل ہوتا ہے تو انبیاء بھی غلبۂ دین کے لئے آتے ہیں، اس لئے ان کا مقصدِ بعثت بھی یہی مخالفت کہی جائے گی، ابوداؤد نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کی

---

[1] لیکن اس میں ذرا یہ تفصیل ہے کہ جوتے پاک ہونا چاہئیں پھر یہ حکم اس وقت تھا جب مسجدوں کے فرش کچے ہوتے تھے اور چٹائی، جانماز وغیرہ نہیں بچھائی جاتی تھی بعد میں صفائی کے خیال سے بغیر جوتا پہنے ہی نماز پڑھنے کا رواج ہوگیا ہے

روایت نقل کی ہے: "لا تزال امتی بخیر ما لم یؤخروا المغرب الی ان تشتبك النجوم" "میری امت اس وقت تک کامیاب رہے گی جب تک کہ وہ مغرب کی نماز میں تاخیر نہ کرے"

ابن ماجہ نے حضرت عباسؓ سے امام احمدؒ نے سائب بن یزیدؓ سے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس کو یہود کی مشابہت قرار دیا ہے، اور اسی روایت میں ہے: "وما لم یؤخروا الفجر الی محاق النجوم مضاهاة للنصرانیة" کہ جب تک وہ فجر کو تاروں کے چھپنے تک نہ مؤخر کریں جو نصاریٰ کی مشابہت ہے۔

سعید بن منصورؒ عبدالرحمٰن ضابجی سے روایت کرتے ہیں: "لا تزال امتی علی مسکتها ما لم ینتظروا بالمغرب اشتباك النجوم مضاهاة للیهودیة، وما لم ینتظروا بالفجر محاق النجوم مضاهاة للنصرانیة وما لم یکلوا الجنائز الی اهلها"

سعیدؒ کہتے ہیں کہ بشر بن خصاصیہ کی بیوی (لیلیٰ) کہتی ہیں کہ میں نے صوم وصال رکھنا چاہا تو بشر نے مجھے یہ کہہ کر روک دیا کہ حضور نے اسے نصاریٰ کی مشابہت قرار دی ہے اور رات میں افطار کا حکم دیا ہے (احمد)

حضرت انسؓ کی روایت ہے: "ان الیهود کانوا اذا حاضت المرأة فیهم لم یؤاکلوها ولم یجامعوها فی البیوت فسأل اصحاب النبی النبیؐ فانزل اللہ "یسئلونك عن المحیض" فقال" اصنعوا کل شیئ الا النکاح الخ"

یعنی یہود حائضہ عورت کو اچھوت سمجھ کر اس کے ساتھ کھانا اور اٹھنا بیٹھنا بھی ترک کر دیتے تھے صحابہؓ نے آپ سے پوچھا تو آیت اتری، پھر آپ نے فرمایا کہ جماع کے

سوا اور کوئی چیز منع نہیں، جب یہود کو یہ معلوم ہوا تو وہ کہنے لگے کہ یہ شخص تو ہمارے مطلب کی ایک بات بھی اپنے دین میں باقی نہیں چھوڑتا، اسید بن حضیرؓ، عباد بن بشرؓ نے آکر حضورؐ سے عرض کی کہ یہود تو ایسا ایسا کہتے ہیں کیا ہم عورتوں کے ساتھ بھی نہ رہیں؟ یہ سن کر چہرۂ اقدس کا رنگ غصہ سے بدل گیا یہ دیکھ کر یہ لوگ وہاں سے اٹھ آئے تو پھر حضورؐ نے دودھ کا ہدیہ بھیجا جس سے ان کو تسلی ہوئی کہ حضورؐ خفا نہیں ہیں (مسلم) ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ یہ مخالفت اصل حکم اور وصف حکم دونوں میں ہوتی ہے، حائضہ سے اجتناب کی اصل میں تو اختلاف نہیں ہاں وصف میں ہے، طہارت کے باب میں یہود کے ہاں بڑی سختی تھی، اس کے برخلاف نصاریٰ کے ہاں اتنی ڈھیل اور چھوٹ تھی کہ کوئی چیز ناپاک ہی نہیں ہوتی تھی، شریعت مطہرہ نے طہارت اور پاکیزگی کا بھی ایک درمیانی راستہ نکالا جس میں ان دونوں قوموں کی افراط و تفریط باقی نہ رہی۔

اوقات نماز میں تشبہ سے ممانعت

نماز اور عبادت کے اوقات میں مومنین اور مشرکین کا امتیاز ضروری تھا اس لئے جس طرح خدا اور مابعد الطبیعی حقائق کے تصور میں ان دونوں میں اختلاف ہے، اسی طرح ان کے طرز بندگی اور اظہار عبدیت میں بھی تفاوت ہے ہمارے ہاں تنزیہہ اپنی آخری شکل میں موجود ہے، اور دوسروں کے ہاں تشبیہ اور استعاروں کے جسم میں مقید، توحید بھی ہے تو شرک و الحاد کا رنگ لئے ہوئے ہے

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں!

ابن تیمیہؒ عمرو بن عبسہؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ان کا بیان ہے "میں جاہلیت میں بھی بت پرستی سے بیزار تھا، آنحضرتؐ کی بعثت کی خبر سن کر خدمت بابرکت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا ابھی واپس جاؤ جب میری مشکلات کم ہو جائیں تو آنا چنانچہ میں نے ہجرت کے بعد مدینہ حاضر ہو کر حضورؐ سے پوچھا آپؐ مجھے پہچانتے ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا ہاں تم تو مکہ میں مجھ سے ملے تھے، پھر میں نے نماز کے اوقات معلوم کئے تو آپؐ نے طلوع آفتاب کے وقت نماز سے روکا کہ یہ شیطان کی کارستانیوں کا وقت ہے اور مشرکین کی پوجا بھی اسی وقت ہوتی ہے، پھر زوال کے وقت بھی منع فرمایا کہ اس وقت جہنم دہکائی جاتی ہے، پھر غروب کے وقت بھی آفتاب شیطان کی دو سینگوں کے درمیان ڈوبتا ہے، اور مشرکین پوجا کرتے ہیں، اس لئے اس وقت نماز سے منع فرمایا" (مسلم) ان اوقات میں نماز سے اس لئے روکا گیا کہ لوگ کہیں غلط فہمی میں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ دونوں کا تصورِ الوہیت اور طرزِ عبادت ایک ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ اگرچہ بہت سے آدمی یہ علت نہیں جانتے لیکن پھر بھی عام طور سے ان تین وقتوں میں روک دیا گیا تاکہ مشابہت کا جڑ سے خاتمہ ہو جائے۔

اسی مشابہت سے بچنے کے لئے آنحضرتؐ نے سُترہ (لکڑی) کو بالکل سامنے رکھنے سے منع فرمایا ہے بلکہ ذرا دائیں یا بائیں رکھنے کا حکم ہے تاکہ اس کو سجدہ کا گمان نہ ہو، اور اسی لئے کسی کی طرف رخ کر کے سجدہ سے بھی روکا گیا کہ غیر اللہ

کو سجدہ کرنے کا اندیشہ نہ پیدا ہو۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے نماز میں کسی کو بائیں ہاتھ پر ٹیک لگائے دیکھا تو منع کیا کہ اس طرح معتوب لوگ بیٹھتے ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ "یہ مغضوب لوگوں کی نماز ہے" یہ روایتیں ابوداؤد میں موجود ہیں۔

بخاری میں حضرت مسروقؒ کی حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نماز میں کمر پر ہاتھ رکھنے کو ناپسند فرماتی تھیں اور کہتی تھیں کہ یہ یہود کا فعل ہے، حضرت ابوہریرہؓ نے حضورؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے اس سے منع فرمایا ہے (مسلم) زیاد بن صبیح کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار حضرت عمرؓ کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے اپنی کمر پر ہاتھ رکھا تو آپ نے نماز بعد فرمایا کہ یہ نصاریٰ کی مشابہت ہے اور اس سے صلیب کی صورت پیدا ہوتی ہے "ھذا الصلب فی الصلوٰۃ وکان ﷺ ینھی عنہ" (احمد، ابوداؤد، نسائی) حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے، حضورؐ بیمار تھے، اس لئے بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے، اور حضرت ابوبکرؓ آپ کی تکبیر لوگوں تک پہنچا رہے تھے، اور ہم لوگ آپؐ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے تو آپ نے بیٹھ کر پڑھنے کا ارشاد فرمایا، ہم لوگ بیٹھ کر پڑھنے لگے پھر آپؐ نے سلام کے بعد فرمایا، تم لوگوں نے فارس اور روم کا انداز اختیار کیا تھا کہ ان کے بادشاہ بیٹھے اور وہ دربار میں کھڑے رہتے ہیں، امام جس طرح پڑھائے تم بھی اسی طرح پڑھا کرو (مسلم، ابوداؤد[1]) ابوداؤد کے سوا دوسری روایتوں میں ہے،

---

[1] احناف کے یہاں امام اگر قیام سے معذور ہو تو مقتدی اس کے پیچھے کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھیں گے، اس لئے کہ وہ معذور نہیں۔

"ولا تعظمونی کما یعظم الاعاجم بعضھا بعضًا" (عجمی طرز پر میری تعظیم نہ کرو)

شیخ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ آنحضورؐ نے عجم کی مشابہت کے سبب قیام جیسے اہم رکن کو چھڑا دیا جو نماز میں فرض ہے اس سے شریعت کی روح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم جب تک جنازہ قبر میں نہ رکھا جائے بیٹھتے نہیں تھے، ایک دفعہ ایک پادری نے آپ سے کہا محمد! ہم بھی ایسا ہی کرتے ہیں یہ سن کر آپؐ بیٹھ رہے اور فرمایا کہ ان کی مخالفت کرو، (ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی)

جنازہ کے لئے کھڑا ہونے کی روایتیں ہیں، مگر حضرت علیؓ کی روایت میں اس کے برعکس بھی ہے، بخاری نے عبدالرحمٰن بن قاسم سے روایت کی ہے کہ قاسم جنازہ کے سامنے چلتے تھے، اس کے لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے، اور حضرت عائشہ کا قول نقل کرتے تھے کہ قیام جاہلی دستور ہے۔

ابن عباسؓ سے مروی ہے رسول اللہؐ نے فرمایا، "اللحد لنا والشق لغیرنا" (ہمارے لئے لحد اور دوسروں کے لئے سیدھی قبر ہے) (سنن اربعہ)

جریر بن عبداللہ بجلیؓ فرماتے ہیں، حضرت رسول اللہؐ نے فرمایا "بغلی قبر ہمارے لئے اور کھلی قبر نصاریٰ کے لئے ہے" (احمد)

جاہلیت سے ممانعت

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں ہے:-

"لیس منا من ضرب الخدود، وشق الجیوب ودعا بدعوی الجاھلیة" (متفق علیہ) یعنی جو کسی کی موت پر اپنے چہرے پر مارتا، گریبان چاک کرتا

اور جاہلی کلمات بکتا ہے' وہ ہم میں سے نہیں ہے ———— ابو مالک اشعری ؓ کی روایت میں ہے ' میری امت جاہلیت کے چار کام نہیں چھوڑ سکے گی، (۱) قومیت کا فخر، (۲) نسب میں طعنہ زنی (۳) ستارہ سے خبر گیری، (۴) نوحہ گری ———— اور نائحہ اگر توبہ نہیں کرتی تو وہ قیامت میں گرم تانبے کا پاجامہ اور خارش کا کرتہ پہنائی جائے گی۔ (مسلم) ایام جاہلیت میں عربی عورت آج کی فیشن ایبل اور انتہا پسند (Ultra Modern) خواتین ہی کی طرح آرائش جمال اور نمائش حسن میں عریانی کی حد تک پہنچ چکی تھی، بلکہ طواف کعبہ بھی عریاں ہوتا تھا، قرآن نے اس بڑھی ہوئی آزادی پر بریک لگائی اور مسلم خواتین کو حکم ہوا کہ نقاب وحجاب میں رہو اور جاہلیت کی روش چھوڑ دو، "وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ" (۳۳ : ۳۳)

حضرت ابوذر ؓ نے کسی کو ماں کا طعنہ دیا تو آپ ؐ نے انھیں ڈانٹا کہ تم میں ابھی جاہلی نخوت باقی ہے' (انك امرؤ فيك الجاهلية) اسی طرح قرآن مجید میں ہے، "اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ" (۴۸ : ۲۶) (جب کافر جاہلی حمیت پر اتر آئے) حمیت جاہلی میں نسب کے فخر وغرور اور ہر قسم کے آداب ورسوم سے اجتناب کی طرف اشارہ فرمادیا گیا۔

بخاری میں ابن عباس ؓ کی روایت ہے' تین چیزیں جاہلیت کی یادگار ہیں' نسب میں طعنہ زنی، نوحہ گری، سفیان کہتے ہیں اور تیسری چیز نجوم کا ماننا، مسلم میں حضرت ابوہریرہ ؓ کی حدیث ہے کہ لوگوں میں دو باتیں کفر کے انداز کی ہیں، نسب میں طعن، اور مردہ پر نوحہ!!

صحیحین میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر مہاجرین کے ایک ظریف نے ایک انصاری صحابی کو مار دیا جسپر بات بڑھ گئی اور دونوں نے اپنی قوم کی دھائی دی تو حضورؐ نے دریافت فرمایا "یہ جاہلی للکار کیسی؟ پھر جب لوگوں نے بتایا تو آپؐ نے فرمایا اس مردار رسم کو چھوڑ دو، (دعوھا فانھا منتنہ) انصاری اور مہاجر دونوں شرعی خطاب ہیں لیکن جب غلط مقصد کے لئے اور عصبیت کو ابھارنے کے لئے انھیں استعمال کیا گیا تو آپ نے اسے جاہلیت کہا ——— ابوداؤد کی حدیث میں عبدالرحمٰن بن ابی عقبہ کہتے ہیں کہ میں فارسی غلام تھا، احد میں جب میں نے ایک مشرک کو مارا تو فخریہ کہا "انا الغلام الفارسی" (میں ایران نژاد ہوں) اس پر حضورؐ نے فرمایا تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ "خذھا منی وانا الغلام الانصاری" (کہ میں ایک انصاری ہوں)۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے حضرت رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے تم سے جاہلی تکلف و عصبیت ختم کردی اب یا تو مومن متقی ہوگا یا فاجر شقی، تم سب آدم زاد ہو اور آدم مٹی کے تھے، اور جو آبائی غرور میں مبتلا ہے، وہ جہنم کا ایندھن اور غلاظت کا کیڑا ہے (ابوداؤد)

مسلم میں انہی کی روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا "جو اطاعتِ امیر سے نکلا اور جماعت کو چھوڑا تو وہ جاہلیت کی موت مرا، اور جو جاہلی عصبیت کا داعی ہو یا اس کی مدد کرے یا اس کے لئے خفا ہو اور مارا جائے تو جاہلی طور پر قتل ہوا، اور جو میری امت پر بے محابہ تلوار کھینچتا ہے وہ میرا نہیں ہے۔

انہی کی دوسری روایت میں اس کی تشریح ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "ایک زمانہ وہ ہوگا کہ قاتل و مقتول کسی کو اپنے موقف کا پتہ نہ ہوگا بس خون کا چسکہ لگا ہوگا اور دونوں جہنمی ہوں گے، مسلم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے، ابغض الناس الی اللہ ثلاثۃ ملحدٌ فی الحرم ومبتغ فی الاسلام سنۃ الجاھلیۃ ومُطلبُ دم امرئٍ بغیرِ حقٍ لیریق دمہ" تین آدمی خدا کو حد درجہ ناپسند ہیں، حرم میں فتنہ پردازی کرنے والا، اسلام میں جاہلی سنت کا احیاء کرنے والا اور ناحق خون بہانے والا) فساد دنیا میں قتل اور فساد دین میں حرم کی بے حرمتی ہے، اس لئے کہ جیسے وہاں کے عمل کا ثواب زیادہ ویسے ہی عذاب بھی کم نہیں اور صحیح مسلک یہ ہے کہ اب شہر حرام کی حرمت تو باقی نہیں مگر حرمت بلد حرام باقی ہے۔

پھر جاہلیت' حال اور صفت بھی ہے اور اسم و ذوالحال بھی یعنی اس میں دور جاہلیت اور عہد جہالت بھی اور ایام جاہلیت کی شخصیات، رسومات اور عادات بھی شامل ہیں، حاصل یہ ہے کہ ہر وہ شے جس کا کسی قسم کا تعلق 'جاہلیت' سے ہو وہ اسلام میں ممنوع ہے (الا یہ کہ اس میں جاہلیت کے معنی نہ پائے جائیں۔ جیسے فضائل اخلاق، عفت و شجاعت، کرم و سخاوت وغیرہ جاہلی دور کی چیزیں نہیں، بلکہ عالمی اقدار ہیں جنھیں اسلام نے ترقی دی، اور کہا "خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام")۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ جہل صرف عدم علم ہی کو نہیں کہتے بلکہ خلاف حق اور خلافِ علم، عمل کو بھی جہل کہتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

"اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَھَالَۃٍ" (النسٓ

ان کی توبہ قبول کرتا ہے جو ناواقفیت میں غلطی کرتے ہیں)

صحابہ کرامؓ کہا کرتے تھے کہ جو کوئی بھی برا کرتا ہے وہ جاہل ہے، کل من عمل سوءاً فھو جاھل، اس کی وجہ یہ ہے کہ علم اس یقین کو کہتے ہیں جس سے آدمی اپنے قول وفعل کا ایک معیار قائم کرتا ہے، اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے حقیقی علم حاصل نہیں یا اس کی قوت ارادی کمزور ہے اور یہ دونوں صورتیں حقیقتِ علم کے خلاف ہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ جاہلیت چونکہ ایک غیر اخلاقی اور غیر علمی طرزِ عمل ہے اس لئے وہ صرف ماقبل اسلام کے عرب ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ وہ ہر مذہب و تہذیب میں پائی جاسکتی ہے، اور ہر دور و دیار میں اسے دیکھا جاسکتا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی!

ان کا کہنا ہے کہ اسلام سے پہلے جاہلیت عامہ کا وجود تھا اور دنیا جہالت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی لیکن جب بوقبیس اور فاران کی اوٹ سے صبح سعادت طلوع ہوئی اور علم کا آفتاب غار حرا سے نکل کر چلا تو دنیا سے جہالت کا وجود مٹ گیا، اور اعلان کردیا گیا کہ اب دنیا میں جہالت اپنی اصل شکل میں کبھی ظاہر نہیں ہوسکتی، کیونکہ قیام قیامت تک علم وحق کا ایک جانثار گروہ موجود رہے گا، "لاتزال من امتی طائفۃٌ ظاھرین علی الحق الی قیام الساعۃ"۔

مغضوب قوموں کی سرزمین بھی مغضوب

[یہ سنت اللہ ہے کہ خدا کے محبوب بندوں کی ہر شے خدا کو محبوب اور مغضوب قوموں کی ہر چیز اسے مغضوب ہوتی ہے، مسجد اقصیٰ کی زمین انبیاء کی سرزمین رہی ہے، اس لئے اسے قبلۂ اولیٰ بنایا گیا اور "بَارَكْنَا حَوْلَهُ" کا خطاب دیا گیا، حضرت ابراہیمؑ کی پوری حیات بابرکات ہے، جس طرح انھیں قبول عام وبقائے دوام کی نعمت ملی ویسے ہی ان کی ہر یادکو یادگار بنادیا گیا، خانۂ کعبہ کو بیت مبارک کہا گیا مکۃ المکرمہ کو البلد الحرام، اور مبارک بتایا گیا، "وادی غیر ذی زرع" کو ظاہری اور باطنی دونوں طرح خیرات وبرکات، فتوحات وکرامات کا گہوارہ بنادیا گیا ؎

بہارِ عالم حسنش دل وجاں تازہ می دارد
برنگ اربابِ صورت را بہ بو اصحاب معنی را

ظاہری طور پر تو یہ کہ اس "شورہ بوم" کو گل وگلزار بنادیا گیا طائف کو جنت نشان کردیا گیا، مدینہ طیبہ سرسبز وشاداب ہوا، زمزم کا چشمۂ فیض جاری ہوگیا، اور آج زرِ سرخ وسیاہ سے اسے مالا مال کر ڈالا گیا، ایک بڑی نعمت حرمین شریفین پر یہ بھی رہی ہے کہ اسلام کے بعد بلکہ پہلے بھی غیر عربی قوم کا اس پر کبھی پورا تسلط نہیں ہوا، اور ترکانِ احرار نے اس سرزمینِ حریت سے رشتہ جوڑا تو حکومت سے زیادہ خدمت واطاعت کا، سلطانِ معظم اپنے کو خادم الحرمین ہی لکھتے رہے۔

تاتاری اور صلیبی حملوں کا سیل بلاخیز بارہا عالمِ اسلام کے سر سے گذر گیا

لیکن اس مقدس اور عظیم خطہ کی طرف کسی کو تاکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

اور باطنی انعام واکرام کا تو اندازہ بھی دائرۂ خیال سے باہر ہے، حضرت ابراہیمؑ سے پہلے بھی یہ سرزمین انبیاء کی سرزمین اور دولتِ الہام وہدایت کی امین رہی ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کے بعد تو خاص طور پر یہ خطہ رشد وصلاح اور خیر وفلاح کا گہوارہ، اور روشنی کا منارہ رہا ہے، آخری نبیؐ یہیں آئے جنھوں نے تاریخ نبوتؐ رسالت کی از سرِ نو بازیافت اور انسانیت کی متاع گم گشتہ کو بارِ دگر دریافت کیا، آخری اور کامل دین یہیں سے پھیلا جس نے دین وشریعت کا صحیح معیار قائم کیا، اور جس نے دین ودنیا کو بہم کرکے بیمار انسانیت کو ایک نسخۂ کیمیا عطا کیا، اسی کہسار کی وادیوں میں ۲۳ سال تک وہ صحیفۂ انسانیت اترتا رہا، جس نے کتب خانۂ عالم کی لاج رکھ لی اور جس نے گم شدہ سچائیوں اور قدروں کا تعارف دنیا سے از سرِ نو کرایا۔

یہیں سے ملت مرحومہ اور امتِ وسط نے اپنی مہمات (Mission) کا آغاز کرکے بین اقوامی انسانیت اور حریت ومساوات کا علم بلند کیا اور نوعِ انسانی کے لئے عظمت وخدمت کا نیا معیار قائم کر دکھایا، جو مغرب ومشرق کی قوموں کا تختۂ مشق بنی لیکن وہ خود فتنۂ روزگار کبھی نہیں بن کر رہی اور نہ اس نے انسانیت کا استحصال کیا، جو مغرب کے تسلط کے بعد اکثر پائمال اور مفلوک الحال رہی ہے لیکن اس نے دنیا کو اپنی معنوی قدروں سے ہمیشہ مالامال اور خوش حال رکھا ہے ؎

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب چاک گریباں سل ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے (مجازؔ)

بات یہاں سے چلی تھی کہ خدا کی نفرت و محبت بھی عمیق اور ابدی ہوتی ہیں اور ان دونوں کا پیمانہ بھی خدائی صفات کے بقدر وسیع ہوتا ہے[1]۔]

ابن تیمیہؒ نے صحیحین سے ابن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک سفر میں حضورؐ کو اصحابؓ کے ساتھ ثمود کی سرزمین حجر میں اترنا پڑا چنانچہ لوگوں نے مجبوراً وہاں کے کنوؤں سے پانی پیا اور آٹا وغیرہ گوندھا حضورؐ کو جب معلوم ہوا تو آپ نے حکم دیا کہ جو پانی باقی ہے اسے بہا دیا جائے، اور وہ آٹا اونٹوں کو کھلا دیا جائے اور پھر انھیں دوسرے کنویں سے پانی بھرنے کا حکم دیا۔

اور حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے حجر سے گذرتے ہوئے فرمایا، "لا تدخلوا علی ھؤلاء المعذبین الا ان تکونوا باکین فان لم تکونوا باکین فلا تدخلوا علیھم، ان یصیبکم ما اصابھم" ان معذب لوگوں کے علاقے سے روتے ہوئے گذرو ورنہ مت گذرو، اس لئے کہ ان کا عذاب تمہیں بھی گھیر سکتا ہے، ابن تیمیہؒ گذشتہ حدیث کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ وہ غزوۂ تبوک سے واپسی کا موقع تھا اور تنگی کا یہ حال تھا کہ اسے "غزوۃ العسرۃ" کہا جاتا ہے لیکن اس حالتِ اضطرار میں بھی انھیں اپنی رزقِ کفاف بھی اونٹوں کو دینے کا حکم ہوا۔

ایسی ہی دوسری حدیث میں ان قوموں کے ویرانوں میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا، ابوداؤد نے ابوصالح غفاری کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ ایک با

---

[1] واضح رہے کہ صفات باری میں غضب و محبت اور جو دوسرے جذبات کا بیان ہوتا ہے وہ تاثر و انفعال پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ ان کا منشا بندوں کے افعال ہوتے ہیں۔ (رشس)

بابل سے گذرے تو جب باہر نکل آئے تب نماز پڑھائی اور نماز کے بعد فرمایا میرے حبیبؐ نے مقبرہ میں نماز سے منع کیا ہے اور ارض بابل کی لعنت کی وجہ سے وہاں بھی نماز سے روکا ہے۔

امام احمد نے بھی یہ روایت نقل کی ہے اور ان جگہوں میں نماز کو مکروہ کہا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ ان احادیث کے مفہوم کی وہ آیت مطابقت کرتی ہے جس میں آپ کو مسجد ضرار میں آنے سے منع کیا گیا کہ لا تقم فیہ ابدًا (۹ : ۱۰۸) مسجد ضرار کو جہنم اساس قرار دیا گیا تھا اسی لئے جب اسے ڈھایا گیا تو اس سے دھواں نکلا۔

اسی کے مقابل رحمت کے مقامات پر نماز مستحب قرار پائی جیسے مسجد ثلثہ اور مسجد قباء وغیرہ میں کہ وہاں ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے۔

تشبہ کی کچھ صورتیں!

تشبہ کی بنیادی حدیث ابوداؤد نے ابن عمرؓ کی روایت سے لکھی ہے، "من تشبہ بقوم فھو منھم" اس میں ابن ابی شیبہ، ابو نضر، حسان بن عطیہ ایسے مشاہیر ہیں، جن کے بارے میں ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ یہ اس سے کہیں بلند ہیں کہ انھیں صحیحین کے رجال کے طور پر جانا جائے ——— اس کی سند کو قوی بتاتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ اس حدیث کی رو سے کم از کم تشبہ حرام ٹھہرتا ہے، ورنہ عبداللہ بن عمرو تو اسے کفر کہتے ہیں "من بنی بارض المشرکین وصنع نیروزھم ومھرجانھم وتشبہ بھم حتی یموت حشر معھم یوم القیامۃ" (جو مشرکین کے درمیان

پہننا اور ان کی عید نوروز اور تودارمنا تا ہے اور ان کی صورت اختیار کرتا ہے اور مرتا ہے تو قیامت کے دن انہی کے ساتھ اٹھایا جائے گا، اس کی تاویل یہ ہے کہ اگر مشابہت مطلق ہو تو یہ حکم ہے یا پھر مشابہت جس درجہ کی ہوگی ویسا ہی حکم ہوگا پھر تشبہ کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی قوم کے کسی فعل کی اس لئے متابعت کی جائے کہ وہ ان کا فعل ہے یا کسی اپنے ذاتی مقصد کے لئے کسی غیر کی پیروی کی جائے ـــ ایک صورت اور یہ ہے کہ مسلمان کا عمل غیر شعوری طور پر کسی اور کے مشابہ ہو جائے تو اس مشابہت میں کلام ہے لیکن منع اس سے بھی کیا جائے گا تاکہ یہ تشبہ کا ذریعہ نہ بن جائے، اس لئے کہ حدیث میں غیر موجود سے بھی مشابہت سے روکا گیا جیسے اعفاء لحیہ وغیرہ کا حکم۔

قاضی ابو یعلیٰ نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے "وانہ نھی عن التشبہ بالاعاجم وقال من تشبہ بقوم فھو منھم" (آپؐ نے عجم کی مشابہت سے روکا اور فرمایا جو کسی قوم جیسا بنتا ہے وہ انہی میں سے ہوتا ہے)

محمد بن حرب کہتے ہیں امام احمدؒ سے سندھی جوتے کے بارے میں پوچھا گیا تو مرد و عورت دونوں کے لئے ناپسند فرماتے ہوئے کہا اگر وضو اور بیت الخلاء کے لئے ہو تو درست ہے۔

سعید بن عامرؒ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو کہا "سنۃ نبینا احب الینا من سنۃ باکھن" (ہمارے نبی کی سنت باکھن راجہ کی سنت کے مقابلے میں ہمیں زیادہ پسند ہے)

مروزی کی روایت میں ہے کہ ان سے سندھی جوتے کے لئے پوچھا گیا تو فرمایا

میں تو اسے پہنتا نہیں (یعنی پسند نہیں کرتا) ہاں کیچڑ مٹی اور نجاست سے بچنے کے لئے ہو تو اسے جائز سمجھتا ہوں، لیکن زینت کے لئے اسے جائز نہیں کہتا، کسی دروازے پر آپ نے سندھی جوتے دیکھے تو فرمایا کہ اب ہم بھی اولادِ ملوک کی پیروی کرنے لگے، حرب کرمانی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے ان مضبوط جوتوں کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ سندھی جوتے وضو، یا بیت الخلاء یا کسی ضرورت کے لئے ہوں تو جائز ہیں، ایسے ہی لکڑی کے کھڑاؤں کو آپ نے ضرورۃً جائز بتایا۔

ابن مبارک سے کرمانی جوتوں کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا "یہ ہمارے سادے جوتے کیا کم ہیں؟ سعید بن عامرؒ سے سبتی جوتوں کے بارے میں معلوم کیا گیا تو فرمایا کہ نبی کی سنت ملکِ ہند کی سنت سے زیادہ پسند ہے، اگر یہ جوتے مسجد نبوی میں ہوں تو انھیں مدینہ سے باہر پھینک آؤ" اور یہ سعید بن عامرؒ اس پایہ کے شخص ہیں کہ ابن تیمیہ انھیں اہل بصرہ کا علمی اور دینی امام کہتے ہیں اور امام احمد کے شیوخ میں سے ہیں، یحییٰ بن سعید القطانؒ کی مجلس میں ان کا ذکر آیا تو فرمایا وہ ۴۰ سال سے اہل بصرہ کے شیخ ہیں، مسعود بن الفرات کہتے ہیں، میں نے بصرہ میں سعید بن عامر کا ثانی نہیں دیکھا، میمونی کہتے ہیں میں نے امام احمد کو شملہ ٹھوڑی کے نیچے باندھے دیکھا وہ اس ہیئت کے علاوہ عمامہ کو مکروہ سمجھتے، اور کہتے تھے، "العرب عمائمها تحت اذقانها" حسن بن محمد کی روایت میں امام احمد تالو کے نیچے عمامہ کے شملے کو ناپسند کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ایسا یہود و نصاریٰ اور مجوس کرتے ہیں، وہ اپنے عہد کے (عباسی) ظالمین کا سیاہ سرکاری لباس بھی پہننا مکروہ سمجھتے تھے، وہ نماز میں آنکھیں بند رکھنے کو یہود کا فعل قرار دیتے تھے۔

تشبہ کی چند اور احادیث

عمرو بن شعیب سے ترمذی کی روایت ہے، "لیس منا من تشبّہ بغیرنا لا تشبھوا بالیھود ولا بالنصاریٰ فان تسلیم الیھود: الاشارۃ بالاصابع وتسلیم النصاریٰ: الاشارہ بالاکف" (جو غیروں کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے، یہود و نصاریٰ سے مشابہت نہ کرو، یہود کا سلام انگلیوں کے اشارے سے اور نصاریٰ کا ہاتھ کے اشارے سے ہوتا ہے[1])

ابن تیمیہ کہتے ہیں، اس کی سند میں ابن لہیعہ ہیں، لیکن امام احمد وغیرہ انھیں قابل استناد سمجھتے ہیں، ابوداؤد میں رکانہؓ کی حدیث میں ہے "مشرکین اور ہمارے درمیان فرق ٹوپی پر عمامہ باندھنے میں ہے"۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں، جب حضورؐ نے عاشورہ کا روزہ رکھا تو لوگوں نے کہا کہ اس دن کو تو یہود و نصاریٰ بھی بڑا سمجھتے ہیں، آپ نے فرمایا، آئندہ سال نویں کو بھی روزہ رکھیں گے (مسلم) امام احمدؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے: صوموا یوم عاشوراء وخالفوا فیہ الیھود وصوموا یوما قبلہ ویوما بعدہ ۔۔۔ عاشورا کا روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت ایک دن آگے اور پیچھے مزید روزہ رکھ کر کرو ۔۔۔ بخاری و مسلم میں حضرت عمرؓ کی روایت میں ہے "انا امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب الشھر ھکذا وھکذا[2]"

---

[1] ہاتھ جوڑ کر سلام کرنے کا جو طریقہ ہندوستان میں رائج ہو رہا ہے، وہ بھی اسی حکم میں داخل ہے ۔۔۔ مترجم [2] یہ حکم اس دور کا اور اس وقت کے عام آدمی کے لئے تھا اس سے حساب کتاب کی ممانعت سے کوئی تعلق نہیں ۔۔۔ مترجم

(ہم امی امت ہیں، حساب کتاب نہیں جانتے مہینہ کبھی ۲۹ کا ہوتا ہے اور کبھی ۳۰ کا)
اس حدیث میں آپؐ نے حساب کتاب کو دوسری قوموں کا شعار قرار دیا اور اپنے اوقات کا مدار رویت پر رکھا، اسی لئے دوسری حدیث میں فرمایا "صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ" دوسری روایت میں ہے "صوموا من الوضح الی الوضح" چاند سے چاند تک روزہ رکھو ——— ابن تیمیہ کہتے ہیں علماء کا اس پر اجماع ہے کہ عجمی تصور کے خلاف مسلمانوں کے اوقات کا تعین رویت اور مشاہدہ سے ہے، (حدیث کا منشا حساب کتاب کی مخالفت نہیں، اس لئے کہ قرض وغیرہ کا حساب لکھنے کی تاکید تو خود قرآن میں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اس لئے اس میں دقیق حسابات اور فلکیات وریاضیات پر اعتماد ختم کرنے کی کوشش کی گئی، اور شریعت میں عوام کی خاصی رعایت رکھی گئی..... تاکہ قیاس اور اندازہ سے الگ رہ کر رویت ومشاہدہ پر اعتماد کیا جائے، چاند کی رویت پر حساب رکھنے میں جو فائدے ہیں، اس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے ابن عابدین نے ردالمحتار میں علامہ ابن دقیق العید کا قول اس باب میں نقل کیا ہے۔ مترجم)۔ صحیحین میں حمید بن عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی روایت ہے کہ میں نے حضرت معاویہؓ کو منبر پر ہاتھ میں بال لئے ہوئے دیکھا کہ آپ فرمارہے تھے اے اہل مدینہ تمہارے علماء کہاں ہیں، میں نے حضورؐ کو اس سے منع فرماتے اور کہتے سنا ہے کہ بنی اسرائیل اسی لئے ہلاک ہوئے کہ ان کی عورتوں نے مصنوعی بال استعمال کرنا شروع کئے تھے، سعید بن مسیبؒ نے بھی حضرت معاویہؓ سے دوسرے الفاظ میں روایت کی ہے۔

ابن عمرؓ کی حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ جب کسی کے پاس ایک ہی کپڑا ہو تو اسے ازار بنا کر نماز پڑھے دونوں حصوں کو چادر کی طرح نہ بنائے کہ یہ یہود کا شیوہ ہے۔ (ابوداؤد)

زہد خشک، رہبانیت ہے

[اسلام عدل واعتدال کا مذہب ہے گزشتہ مذاہب میں یہودیت افراط اور عیسائیت تفریط کی طرف مائل تھی ہندو مذہب میں بھی انسان کو ہر لباس میں "ننگِ وجود" مانا گیا اور بدھ مت میں بھی زندگی سے کوئی خاص اعتنا نہیں کیا گیا، اور موت کو غم ہستی کا علاج کہا گیا، غرض کوئی مذہب نہیں جس نے زندگی کو اس کا حق دیا ہو مگر آخرت کی حق تلفی نہ کی ہو، یا دین کے لئے ترک دنیا کی تعلیم نہ دی ہو عبادت کا کمال، اور ریاضت کی معراج یہی سمجھی گئی کہ جسم کی ہر طرح نفی کی جائے اسے ہر لذت سے محروم رکھا جائے، اور اسکا جائز حق بھی نہ دیا جائے، اس لئے کہ جسم وروح کا اجتماع محال ہے، ایک کی زندگی دوسرے کی موت اور ایک کی ناکامی دوسرے کی کامرانی ہے، یہودیت وعیسائیت، اور ہندومت میں جس جس طرح سے جسم کو عذاب میں ہلکان کیا گیا اور اس سے نِروان اور نجات کی توقع کی گئی، وہ انسانی انتہاپسندیوں کا افسوسناک باب ہے، اسلام نے بھی عبادت و ریاضت پر زور دیا لیکن وہیں تک جہاں تک کہ تزکیۂ نفس، اصلاحِ باطن، اور قلب وروح کے لئے اس کی ضرورت تھی، اسلام میں جسم وروح، قلب وقالب، اور نفس وبدن میں تضاد نہیں سمجھا گیا، بلکہ جسم کو روح کے تابع اور ماتحت بنا کر

اسے روح کا ضمیمہ تکملہ اور اس کا آلہ بنا دیا گیا۔

جہاں جسم کے جائز مطالبات وحقوق کی پامالی ہوئی وہاں اسلام نے روک لگا دی، اسلام زندگی کا مذہب ہے وہ ایک طرزِ حیات ہے، اس لئے اس نے جسم کی حق تلفی کو کبھی مقصد نہیں بنایا، بلکہ اس کی پرورش وپرداخت، حفاظت ونگہداشت کی ترغیب دی اور اس کے لئے ابھارا، قرآن کی تعلیم کہ اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو، یا یہ کہ، کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو، یا نکاح کو مودت ورحمت، اور سکون وسکینت کہنا یا جانوروں تک کے جسم میں کاٹ چھانٹ کو خدائی تخلیق میں دخل اندازی قرار دینا یا احادیث میں مثلہ سے منع کرنا، مصنوعی بالوں کا استعمال، عورتوں کا مردوں سے اور مردوں کا عورتوں سے تشبہ، عورتوں کا گودنا گدانا، چہرے کی آرائش کے لئے خال وخط بنانا، حسن کے لئے دانتوں کے بیچ میں فصل ڈالنا، مردوں کا گیسو سنوارنا اور سر کے پچھلے بال کترواکر بابری بنانا، سانڈوں کو داغ کر چھوڑنا، یا آگ سے داغنے سے روکنا یہ سب اسی لئے ہے کہ اس سے اللہ تعالےٰ کی بنائی ہوئی شکل میں تبدیلی آتی ہے اور خود حیوانی یا انسانی جسم کی توہین ہوتی ہے، حدیث میں صاف صاف تعلیم دی گئی کہ انسان کا جسم بھی اس کی روح کی طرح اس کے ہاتھوں میں خدا کی امانت، اس کی حفاظت کرنا اور اس کا حق ادا کرنا بھی عبادت ہے، آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے بدن کا تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے تمہارے مہمان اور تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے، خصی ہونے سے روکنا، اور رہبانیت سے منع کرنا نفس وزندگی کی حفاظت ہی کے لئے ہے ——— مترجم]

ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ ایمان بالرسول کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی عادت

اور عبادت میں غلو سے کام نہ لے گا اور اپنی باگ شریعت کے ہاتھوں میں دیدے گا، ابوداؤد نے حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے حضورؐ نے فرمایا "لاتشددوا علی انفسکم فیشدد علیکم فان قوما شددوا علی انفسہم فشدد اللہ علیہم فتلک بقایاھم فی الصوامع والدیارات" رَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ" (اپنے پر سختی نہ کرو کہ تم پر سختی کی جائے ایک قوم نے ایسا کیا تو اللہ نے بھی ان کے ساتھ سختی کی اور گرجوں، کلیساؤں میں انہی کے جانشین ہیں) سہل اور ان کے والد ابوامامہؓ نے حضرت انسؓ کو بہت ہلکی نماز پڑھتے دیکھا تو حیرت سے ان سے پوچھا آپ نے مسافر کی یا نفل نماز تو نہیں پڑھی، انھوں نے فرمایا نہیں، یہ فرض نماز تھی، حضورؐ بھی ایسی ہی پڑھتے تھے اور پھر آپ نے مذکورہ بالا حدیث نقل کی، صحیحین میں انہی کی روایت ہے "کان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یوجز الصلوٰۃ ویکملھا" (حضورؐ مختصر لیکن حسن وکمال کے ساتھ نماز پڑھتے تھے) نیز صحیحین میں حضرت انسؓ ہی کی روایت ہے "ما صلیت وراء امام قط اخف صلوٰۃ ولا اتم من صلاۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم" (میں نے آنحضرتؐ کے سوا کسی امام کے پیچھے اتنی ہلکی لیکن شرائط وآداب کی جامع نماز نہیں پڑھی) بخاری کی روایت میں اتنا اور زیادہ ہے کہ حضورؐ اگر بچے کے رونے کی آواز سنتے تو اس کی ماں کے خیال سے نماز اور مختصر فرما دیتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جیسے دوسرے کاموں کے خیال اور ضروریات کی رعایت سے نماز میں تخفیف کی جانا چاہیئے اور ایسا کرنا اچھا ہے، خوارج کے بارے میں حضورؐ نے پیشگوئی کی تھی کہ ان کی نمازیں ریاکاری کے سبب اتنی طویل ہوں گی کہ لوگ اپنی عبادت کو ان کے مقابلے پر حقیر

سمجھیں گے۔

حضرت علیؓ نے جب بصرے میں نماز پڑھی تو عمران بن حصینؓ نے فرمایا، اس نماز نے مجھے حضورؐ کی نماز کی یاد تازہ کردی، وہ قیام و قعود مختصر لیکن رکوع و سجود طویل کرتے تھے، ابوداؤد و نسائی میں سعید بن جبیرؒ کا قول ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے تھے، "آنحضرتؐ جیسی نماز اس جوان (عمر بن عبد العزیزؒ) کے سوا کسی امام کے پیچھے پڑھنے میں نہیں آئی ـــــ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ آنحضورؐ فجر میں عموماً ۶۰ سے ۱۰۰ آیتوں تک پڑھتے تھے، اس لئے اس کی تاویل یہ ہے کہ اگر نمازی فارغ معلوم ہوتے یا قرأت میں راغب ہوتے تو آپ طول فرماتے ورنہ اختصار فرماتے تھے، شیخ الاسلام یہاں ایک دقیق نکتہ یہ بیان کرتے ہیں کہ نماز میں طول و اختصار بھی عرف پر مبنی نہیں ورنہ ہر عصر و مصر اور ہر محلے کی مسجد کا عرف الگ ہوتا، عرف کا اعتبار عادات میں ہوتا ہے، عبادات میں نہیں، اسی لئے آنحضورؐ نے تخفیف و اتمام دونوں کے حدود بتلا دئے اور فرمایا "انما فعلت هذا لتأتموا بي ولتعلموا صلاتي" میں نے ایسا اس لئے کیا کہ تم میری اتباع کرو اور میری نماز جان لو۔

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ نفس پر بے جا سختی کی وجہ سے شریعت اور تقدیر دونوں میں اللہ تعالیٰ سختی فرماتے ہیں، شرعاً اس طور پر کہ آنحضرتؐ سخت ایجاب و تحریم سے ڈرتے رہتے تھے، جیسے تراویح کی فرضیت (مسواک کی فرضیت، اور پڑوسی کو شامل میراث کرنے کی فرضیت وغیرہ) اور تقدیری طور پر یہ کہ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو اس کی سختی کی وجہ سے عاجز بنا دیتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ شریعت تو سہولت کے لئے ہے نہ کہ مصیبت کے لئے "وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ

وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷ : ۱۵۷)

اسلام میں ترکِ دنیا نہیں

[دنیا میں جو سب سے بڑا جھوٹ بولا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام دنیا سے گریزاں اور ترکِ دنیا کا حامی ہے حالانکہ اسلامی تعلیم کا مطلب صرف اتنا ہے کہ دنیا کو مقصود نہ بنایا جائے بلکہ اسے وسیلہ قرار دیا جائے ایک بڑے اور آخری مقصد کے لئے، دنیا زندگی کی وہ ناگزیر راہ ہے جس پر چل کر ہی منزلِ آخر تک رسائی ممکن ہے، دنیا کھیتی ہے، اور آخرت کی جزا و سزا اس کا حاصل! اس لئے مومن کو پیش نظر صورت نہیں، حقیقت کو رکھنا چاہیئے "دل بیار دست بہ کار" رومیؒ کہتے ہیں دنیا خدا سے غافل ہونا ہے، قماش و معاش، اور تعلقِ فرزند و زن نہیں ــــ خدا کی راہ میں دنیا اگر حائل نہیں تو وہ عین دین ہے حضورؐ نے فرمایا "جو بیوی تمہارے تقویٰ کے لئے مددگار ہو وہ دنیا سے نہیں" ــــ آخری بات یہ کہ اسلام کی تعلیم ترکِ دنیا کی نہیں بلکہ اسی ترک کے ترک کی ہے، تصوف میں جس ترک و توکل اور تجرد کی تعلیم ہے اور جس کے ترجمان نے کہا ہے،

ترکِ دنیا ترکِ عقبیٰ، ترکِ سر   در طریقِ عشق اول منزل است

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ دل کا تعلق ماسوا اللہ اور غیر اللہ سے قائم رکھنے کا جواز نہیں۔ مترجم]

صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ۳ آدمیوں نے ازواج نبیؐ سے ان کی عبادت کا حال سن کر یہ عہد کیا کہ ان میں سے ایک ہمیشہ روزے رکھے گا، دوسرے نے کہا میں نماز ہی پڑھتا رہوں گا، تیسرے نے کہا میں

کبھی نکاح نہیں کروں گا، آنحضورؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے ان سے کہا کیا تم نے ایسا ایسا کہا ہے؟ خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ متقی ہوں اور خدا سے ڈرتا ہوں لیکن روزہ کے ساتھ افطار بھی کرتا ہوں، نمازوں کے ساتھ آرام بھی کرتا ہوں اور نکاح بیاہ بھی۔ جو میری سنت چھوڑتا ہے وہ مجھ سے نہیں (مسلم) ایسے ہی کچھ لوگوں نے ازواج سے آنحضرتؐ کے مبارک احوال سن کر عہد کیا کہ گوشت نہیں کھائیں گے بعض نے کہا، بستر پر نہیں سوئیں گے، آپؐ کو علم ہوا تو آپ نے وہی جملے ارشاد فرمائے۔

ابو داؤد میں ابوامامہؓ کی روایت ہے کہ ایک صاحب نے آپؐ سے سیاحت کی اجازت چاہی تو فرمایا، میری امت کی سیر و سیاحت اللہ کے راستے میں جہاد ہے دوسری حدیث میں کہا گیا "ان السیاحۃ: ھی الصیام" کسی میں کہا گیا روزہ دار ہی سائحین ہیں"۔

شیخ الاسلام" فرماتے ہیں سیاحت کے معنی بے مقصد تفریح اور سیر و سفر کے ہیں، جو اس امت کے شایانِ شان نہیں اسی لئے امام احمدؒ نے فرمایا "لیست السیاحۃ من الاسلام فی شیئ" (سیاحت کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں، اور نہ نبیوں اور صالح بندوں کا یہ شیوہ)۔

قرآن میں سیر فی الارض کی تعلیم عبرت و بصیرت کے لئے آئی ہے، اس لئے بے مقصد سیاحت گویا یہود و نصاریٰ اور دوسری قوموں کا وطیرہ ہے [شیخ الاسلام یہ بات آج سے سات سو سال پہلے لکھ رہے ہیں، مگر آج تو مغرب کا یہ بے مقصد سفر TOURISM کی ایک مستقل اصطلاح بن گیا ہے، اور مغرب کے زیر اثر مشرقی ملکوں

میں بھی محض آمدنی اور سیر و تفریح کے لئے محکمہ سیاحت قائم ہے، مغرب نے علم و ادب، تہذیب و ثقافت، صنعت و حرفت، زندگی کے ہر گوشے میں بے مقصدیت پیدا کی خصوصاً سیاسی اور فلسفیانہ سطح پر یہودیوں نے جو فوضویت اور انارکی اور انتشار پھیلایا ہے، وہ تاریخ کا عبرتناک باب ہے، FREE MASON کی تحریک عالمی سیاسیات میں بے مقصدیت اور تعطل ہی پیدا کرنے کے لئے وجود میں آئی تھی، "ادب برائے ادب" کی مغربی تحریک نے بھی ہر زبان کو بے مقصدیت کا شکار بنا کر رکھدیا اور ژاں پال سارتر کی "وجودیت" اور عصر حاضر کی تجدیدیت نے بھی بے مقصدیت کو اپنا بڑا مقصد بنا لیا ہے ــــــ مترجم]

غلو فی الدین کی بدعت

[دیہاتی مثل ہے کہ زیادہ مٹھاس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں، ایسے ہی ہر چیز میں افراط اس کی افادیت ختم کر دیتی ہے، اسلام جو اعتدال (وسط و نصفت) کا مذہب ہے، اور جو اسی مقصد کے لئے وجود میں آیا تھا تاکہ دنیا میں پھیلی ہوئی افراتفری دور کرے اس نے شروع ہی سے اس نکتہ پر دھیان دیا، حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ جھک کر چل رہا ہے، لوگوں نے کہا کہ یہ تواضعاً ایسا کرتا ہے تو حضرت عمرؓ نے درّے سے اس کی خبر لی اور فرمایا سیدھی طرح چلو کہ تقویٰ اس کا نام نہیں، نماز میں کوئی خشوع خضوع کے لئے سر جھکائے کھڑا ہوتا ہے، تو فقہا نے اسے مکروہ کہا ہے، اسی طرح سفر میں روزے اور نماز میں قصر کی سہولت سے فائدہ نہ اٹھانا بھی دین میں غلو ہے، یہ چند مثالیں ہیں، ورنہ غلو دین کے ہر مسئلے میں

پایا جاسکتا ہے ـــــ مترجم] آنحضورؐ نے فرمایا: "ایاکم والغلو فی الدین فانما أھلك من کان قبلکم الغلو فی الدین" (احمد، نسائی، ابن ماجہ) (غلو فی الدین سے بچو اس لئے کہ اسی نے اگلی امتوں کو ہلاک کیا تھا) ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں غلو اعتقادات و اعمال سب میں پایا جاسکتا ہے اور اس معاملہ میں نصاریٰ سب سے بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے قرآن نے انہی کو مخاطب کیا: "یَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ" (۴: ۱۷۱) (اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو) مذکورہ بالا حدیثی جملے آپؐ نے اس وقت فرمائے جب آپ نے جمرۂ عقبہ کے وقت کنکریاں ہاتھ میں لے رکھی تھیں اور فرما رہے تھے ـــــ امثال ھؤلاء فارموا ـــ یعنی ان جیسی چھوٹی کنکریوں سے شیطان کو مارو ـــــ آپؐ کا اندیشہ صحیح تھا بعد میں لوگوں نے جمرات پر بڑے پتھروں، جوتوں اور چھڑیوں سے مارنا شروع کیا، آج کل موسم حج میں شیطان پر اس "غصہ" کے مظاہر دیکھے جاسکتے ہیں[1]۔

حدود و تعزیرات میں مشابہت

اہل کتاب یا غیر مسلمین سے مشابہت کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ سزاؤں میں اور قانون کی نگاہ میں بھی امیر و غریب کا فرق کیا جائے اور غریبوں کو انصاف نہ مل سکے، صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب ایک مخزومی عورت کی چوری پر حضرت اسامہؓ نے آنحضرت سے سفارش کی تو آپؐ نے نہایت پُرجلال انداز میں فرمایا: "یا اسامۃ اتشفع فی حد من حدود اللہ تعالیٰ؟ انما ھلك بنو اسرائیل انھم کانوا اذا سرق فیھم

---

[1] حضرت ابن عمرؓ دعا میں غلو بھی ناپسند فرماتے تھے اسی سے دوسری عبادات میں بھی غلو کا قیاس کیا جاسکتا ہے جو دین کے نام پر دنیا کے جائز مشاغل سے انسان کو غافل بنا دے ـ مترجم۔

الشریف ترکوہ، واذا سرق فیھم الضعیف اقاموا علیہ الحد والذی نفسی بیدہٖ لوان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا" (اسامہ! تم حدود اللہ کے بارے میں بھی سفارش کرتے ہو بنی اسرائیل اسی لئے ہلاک ہوئے کہ جب ان کا کوئی شریف چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے لیکن ضعیف پر حد قائم کرتے، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کے ہاتھ کاٹتا) ___ صحیحین میں براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے ایک سزا یافتہ یہودی کو دیکھا تو یہودیوں کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم زانی کی حد اپنی کتاب میں پاتے ہو؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے ان کے ایک عالم کو بلا کر قسم دی کہ کیا یہ سزا تورات میں ہے؟ اس نے کہا آپ نے قسم دی ہے، اس لئے کہتا ہوں کہ زنا کی سزا ہمارے ہاں ہے لیکن جب وہ ہمارے اشراف کے طبقہ میں پھیل گیا تو ہم نے ان کی رعایت میں اسپر عملدرآمد ختم کر دیا، البتہ ضعفا پر اسے جاری رکھا، اور پھر داغنے اور کوڑا مارنے کا حکم بنا ڈالا ___ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اے خدا میں پہلا شخص ہوں جو تیری مردہ سنت کو زندہ کرتا ہے، اس کے بعد آپ نے حد جاری فرمائی۔

مزاروں پر حاضری میں مشابہت

مسلم میں جندب بن عبداللہ البجلیؓ کی روایت ہے میں نے حضورؐ کے وصال سے پہلے ۵ چیزیں سنی ہیں ایک یہ کہ میں برأت کرتا ہوں کہ تم میں سے کسی کو دوست بناؤں کیونکہ اللہ نے مجھے اپنی دوستی سے نوازا ہے جیسا کہ ابراہیم خلیل کو شرف بخشا تھا اگر میں دوست بناتا تو ابوبکر کو دوست بناتا تم سے پہلی امتیں انبیاء اور صالحین کی قبروں کو درگاہ

اور مسجد بنالیتی تھیں تم ایسا نہ کرنا ــــ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں ہے کہ آپ نے یہود و نصاریٰ کے اس عمل پر لعنت فرمائی ــ قاتل اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائھم مساجد، مسلم میں لعن اللہ الیھود والنصاریٰ کے الفاظ ہیں، صحیحین میں حضرت عائشہؓ و ابن عباسؓ کی روایت میں بھی یہی کہا گیا، اور صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضرت ام سلمہؓ اور حضرت ام حبیبہؓ .... حضورؐ سے حبشہ کے ایک گرجا "ماریہ" کا ذکر کرتی تھیں کہ اس میں تصاویر تھیں، آپؐ نے سن کر فرمایا کہ جب ان کا کوئی نیک آدمی مرتا ہے تو وہ اس پر گرجا تعمیر کرتے ہیں، اور اس میں تصویریں بناتے ہیں یہ خدا کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔

ابو یعلیٰ موصلی کہتے ہیں کہ حضرت حسنؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ مرقد نبوی کی جالی پر پابندی سے حاضر ہو کر دعا مانگتا تھا تو اسے آپ نے منع کیا اور یہ حدیث سنائی کہ "میری قبر کو زیارت گاہ مت بنانا، تمہارا سلام مجھے ہر جگہ سے یکساں پہنچتا ہے" (فان تسلیمکم یبلغنی اینما کنتم) اسی لئے امام احمد اور امام مالک کا مسلک ہے کہ سلام مسجد نبوی میں داخل ہوتے ہی کرے، اور دعا کے وقت قبلہ رخ ہو جائے۔

مشابہت کے چند اور پہلو

آنحضرتؐ نے یوم عرفہ کے خطبے میں صاف صاف اعلان فرما دیا کہ اسلام اور جاہلیت کسی نقطے پر متفق نہیں ہو سکتے "کل شیٔ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع" (جاہلیت کی ہر بات میرے قدموں تلے پامال ہوتی ہے) ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ میں ابوریحانہؓ کی روایت ہے کہ حضور نے دس چیزوں سے منع فرمایا ہے۔

دانتوں کو مصنوعی طور پر تیز کرنے سے، گودنے سے، بال اکھاڑنے سے، اور مرد کو مرد کے ساتھ، اور عورت کو عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں سونے سے، اور ریشمی لباس سے، (مردوں کے لئے) مونڈھوں پر ریشم کے استعمال سے، لوٹ کے مال سے، اور چیتے کی کھال کے استعمال اور اس پر بیٹھنے سے اور (سونے کی) انگوٹھی پہننے سے۔

ابوداؤد میں عمران بن حصینؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا میں نہ سرخ رنگ استعمال کرتا ہوں، اور نہ زرد کپڑے پہنتا ہوں، اور نہ گریبان میں ریشم لگا ہوا کرتا پہنتا ہوں ـــــــ صحیحین میں رافع بن خدیجؓ کی روایت ہے کہ صحابہؓ نے شکار کو ذبح کرنے کے لئے بانس کو استعمال کرنا چاہا تو آپؐ نے فرمایا جس کے خون بہہ جائے اور جس پر خدا کا نام لیا جائے، اسے کھا سکتے ہو، دانت سے ذبح مناسب نہیں ......اور نہ ناخن سے، اس لئے کہ یہ حبشیوں کا طریقہ ہے، ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ اس میں گلا گھٹنے کا خطرہ ہے اس لئے فقہا اسے منع کرتے ہیں، ہاں ہڈی اور ناخن اگر جسم سے الگ ہوں تو استعمال کی گنجائش ہے، لیکن جمہور اسے ناجائز ہی کہتے ہیں۔

اذان وعبادات میں مشابہت سے ممانعت

[اہل نظر جانتے ہیں کہ اسلام کا طرزِ عبادت تمام مذاہب کے طریق عبادت سے مختلف اور ممتاز ہے، اس میں جو عبدیت و انابت، جو سنجیدگی اور برگزیدگی، اور جو روحانی بلندی ہے وہ کہیں نہیں ملتی، اسی طرح اسلام کی "اذان" بھی صنمکدۂ عالم میں اعلان توحید اور اظہار حق کی بلند ترین شکل ہے، کوئی اذان کے لئے گھنٹی بجاتا ہے کوئی ناقوس اور نقارے کا سہارا لیتا ہے، کوئی سنکھ پھونکتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ

یہ سب طریقے اذان کی عظمت و رفعت کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ اذان میں جس بلند آہنگی، صراحت و وضاحت، اور قوت و شوکت کے ساتھ توحید و رسالت کا کلمۂ حق بلند کیا جاتا اور خدایانِ باطل کا رد کیا جاتا ہے، اس کی تاریخ مذاہب میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

اذان، اسلامی عبادات اور تعلیمات کا رمزِ اعظم، اور علامتی روح ہے۔ حی علی الفلاح کا لفظ بتاتا ہے کہ امت مسلمہ کا نصب العین عبدیت و عبادت میں منحصر ہے، اور وہ صلاح و فلاح کا حاصل، خدا سے تعلق، اور دین و دنیا کے صحیح امتزاج کو سمجھتی ہے یہ جملہ ایک اعلان ہے کہ یہ امت فلاح و کامیابی کا کیا تخیل رکھتی ہے[1]۔ اقبال نے اذان کے امکانات کو خوب سمجھا تھا جب کہا تھا ؎

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز — نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود — ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اقبال نے ایک نظم میں چاند ستاروں اور دوسرے اجرام فلکی کو انسانی امکانات پر گفتگو کرتے دکھایا ہے، اور اس گفتگو کے آخر میں یہ معنی خیز شعر کہا ہے ؎

ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار

اذان کی اس اہمیت کے پیش نظر آنحضورؐ نے اس میں بھی تشبہ کا کوئی شائبہ باقی نہیں چھوڑا، ابوداؤد میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ نماز کے لئے حضورؐ کو فکر ہوئی کہ کیسے لوگوں کو جمع کیا جائے چنانچہ بعض لوگوں نے نماز کے وقت ایک جھنڈا لہرانے کا خیال

---

[1] اذان اور نماز پر حکیمانہ کلام کے لئے دیکھئے مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ کی کتاب "الارکان الاربعہ" صفحہ ۵ اور مابعد۔

ظاہر کیا، لیکن آپ کو یہ پسند نہیں آیا، پھر کچھ لوگوں نے یہودیوں کے سنکھ اور قرنا کا ذکر کیا تو آپ نے ناپسند فرمایا کہ یہ تو یہودیوں کا عمل ہے، اسی طرح ناقوس کے ذکر پر اسے نصاریٰ کی چیز قرار دے کر ناپسند کیا، اس کے بعد عبداللہ بن زیدؓ نے خواب میں اذان کی آواز سنی اور صبح کو آکر حضورؐ سے عرض کیا کہ نیند اور بیداری کے درمیان ایک شخص نے مجھے اذان کی تعلیم دی، اتفاق سے حضرت عمرؓ بھی بیس دن پہلے یہ خواب دیکھ چکے تھے، حضورؐ کو جب علم ہوا تو آپ نے پوچھا کہ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟ آپ نے عرض کیا کہ عبداللہ نے پہلے بتایا اس لئے مجھے شرم آئی، پھر آپؐ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا جیسا عبداللہ بتائیں اسی طرح اذان دو ــــ سعید بن منصورؒ نے بھی سنن میں یہ روایت کی ہے اس میں یہ الفاظ زائد ہیں: "اکرہ ان اشغل رجالا عن صلاتھم باذان غیرھم" (مجھے پسند نہیں کہ دوسروں کی اذان کا سہارا نماز میں لیا جائے) صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے آگ روشن کرنے کی تجویز بھی رکھی تھی لیکن آپ نے اذان واقامت کا حکم دیا، ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ قرنِ یہود کی اصل تو حضرت موسیٰؑ سے ملتی ہے کہ ڈھول بجانا ان کے عہد میں ثابت ہے لیکن ناقوس نصاریٰ کی بدعت ہے وہ فرماتے ہیں کہ دینِ حنیف کا شعار وہی اذان بن سکتی تھی جس میں ذکر اللہ کا اظہار و اعلان ہو جس سے آسمان کے دروازے کھل جاتے، اور شیطان بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، اور رحمت اترنے لگتی ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ آج کل ہمارے عہد میں پنجشنبہ کو بڑی دھوم سے منایا جاتا ہے اور شاہی اہلکار ناقوس وغیرہ بجاتے ہیں، اور نمازوں کے لئے بھی اس کا استعمال کرتے ہیں اور طرح طرح سے عجم کی مشابہت اختیار کرتے ہیں، ان کے یہ حکیمانہ اور مومنانہ

سب جملے قابل داد ہیں:

وهذه المشابهة لليهود والنصارى	یہود و نصاریٰ اور روم و ایران کی مشابہت
وللاعاجم من الروم والفرس	جب مسلمان بادشاہوں نے اختیار کی اور
لما غلبت على ملوك الشرق هي	مسلمانوں کے طور طریق سے منہ موڑا،
وامثالها مما خالفوا به هدى	خدا اور رسول کی مرضیات کو چھوڑا تو اللہ تعالےٰ
المسلمين ودخلوا فيما كرهه الله	نے ان کافر ترکوں کو ان پر مسلط کر دیا جن سے
ورسوله: سلط الله عليهم الترك	فاتحانہ جنگ کا وعدہ تھا، چنانچہ تاتاری
الكافرين الموعود بقتالهم، حتى	حملوں میں انھوں نے عالم اسلام میں وہ
فعلوا في العباد والبلاد مالم يجر	تباہی مچائی کہ جس کی اسلامی تاریخ میں
في دولة الاسلام مثله[1]	کوئی مثال نہیں ملتی۔

اسلامی عبادات سکون و سکینت، وقار و متانت، سنجیدگی اور برگزیدگی کا نمونہ ہیں جبکہ عہد جاہلی اور عہد جدید کی قوموں میں بھی عبادات میں شور شغب پایا جاتا ہے، قرآن میں ہے کہ جاہلیت کی نماز تالیاں اور سیٹیاں بجانے کا نام تھا لیکن اسلام نے دوسرا طرز اختیار کیا، قیس بن عبادہ صحابہؓ کا حال بتاتے ہیں کہ وہ ذکر کے وقت آواز کو پست رکھتے تھے، جنگ و جدال، اور جنازہ کے وقت بھی وہ خاموشی اور سکون پسند کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ عرب جاہلی حج میں مزدلفہ سے سورج نکلنے پر چلتے تھے لیکن آنحضورؐ نے ان کی مخالفت میں طلوع آفتاب سے پہلے چلنے کی ہدایت کی

---

[1] اقتضاء الصراط المستقیم ص۱۱۱

اور فرمایا" وخالف ھدینا ھدی المشرکین" (ہماری سنت مشرکین کی سنت کے خلاف ہے) ایسے ہی وہ عرفات سے غروب سے قبل ہی چلے آتے تھے، مگر آپؐ نے بعد غروب چلنے کا حکم دیا، جمہور کے ہاں وقوف ابعد الغروب اسی لئے واجب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک بار مجھے زرد لباس پہنے دیکھا تو فرمایا کہ یہ کفار کا لباس ہے، اسے مت پہنو" ان ھذہ من ثیاب الکفار لا تلبسھا" (مسلم) دوسری حدیث میں سونے چاندی کے برتنوں کے لئے فرمایا گیا، وہ دنیا میں کافروں کے لئے ہے، اور آخرت میں مومنوں کے لئے۔

صحیحین میں ابو عثمان نہدی کے نام حضرت عمرؓ کا وہ خط نقل ہوا ہے، جس میں انھوں نے آذربیجان کی مہم کے کمانڈر عتبہ بن فرقد کو لکھا تھا: "مال غنیمت نہ تمہاری ماں کا ہے، نہ باپ کا جو تم کھاتے ہو مسلمانوں کو بھی وہی کھلاؤ، تنعم اور مشرکین کی مشابہت اختیار نہ کرنا، نہ ریشم پہننا، اس لئے کہ حضورؐ نے صرف ۲ انگل ہی اس کی اجازت دی ہے"!

ابن سیرینؒ کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے ایک گھر میں تانبے پیتل وغیرہ کے لوٹے دیکھے تو اس میں داخل نہیں ہوئے اور فرمایا کسی قوم کی مشابہت اس قوم کا فرد بن جانا ہے، علی سداق کہتے ہیں کہ ایک دعوت ولیمہ کے موقع پر حضرت امام احمد بن حنبلؒ تشریف لائے، لیکن جب انھوں نے کرسی پر چاندی کے نقش دیکھے تو اس گھر سے نکل کر واپس جانے لگے صاحب خانہ انھیں منانے گیا تو آپ نے ہاتھ کو زور سے جھٹک کر فرمایا: زی المجوس، زی المجوس، "تم نے تو مجوس کی نقل اپنائی ہے!

صالح کی روایت میں ہے کہ جب کسی دعوت میں نشہ، یا کوئی منکر ہوتا یا سونے چاندی کے برتن ہوتے یا دیواروں پر پردے پڑے ہوتے تو آپ کبھی نہیں ٹھہرتے تھے

مسئلہ تشبہ میں ائمہ اربعہؒ کا اجماع

اس باب میں مذاہب اربعہ کی وہ بنیادی تصریحات درج کی جاتی ہیں جو مسئلۂ تشبہ میں ائمہ اور علما سے منقول ہیں، امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے کہ تاخیر صلاۃ تعجیل سے بہتر ہے، البتہ جاڑوں میں ظہر میں تعجیل کی اجازت ہے، احناف نے مغرب کی تعجیل کی علت یہ بتائی ہے کہ اس میں یہود کی مشابہت ہے وہ اسی وجہ سے محراب اور طاق میں امام کے یا کسی نمازی کے کھڑے ہونے کو مکروہ کہتے ہیں کہ اس میں بھی اہل کتاب کی مشابہت ہے، یوم شک کا روزہ رمضان کا روزہ سمجھ کر رکھنا اسی لئے مکروہ کہا گیا کہ اہل کتاب اپنے روزوں میں کمی زیادتی کر لیتے تھے، امام محمدؒ نے جامع صغیر میں فرمایا ہے کہ صرف چاندی کی انگوٹھی جائز ہے، اس لئے احناف کا کہنا ہے کہ پتھر، لوہے، اور کسی دھات کی انگوٹھی حرام ہے، اور اس کے ثبوت میں وہ حدیث ہے جس میں کسی کے ہاتھ میں تانبے کی انگوٹھی دیکھ کر آپ نے فرمایا: مالی اجد منك ریح الاصنام؟ (مجھے تم سے بتوں کی بو آرہی ہے) اسی طرح کسی کی انگلی میں لوہے کی انگوٹھی دیکھ کر آپؐ نے فرمایا: مالی اری علیك حلیۃ اھل النار (مجھے تمہارے بدن پر اہل نار کا زیور نظر آتا ہے) اس کے علاوہ بھی تصویر والے کپڑے پہن کر یا ان کے سامنے نماز پڑھنا، یا ریشم کو کسی طرح استعمال کرنا احناف کے ہاں منع ہے تشبہ ہی کی وجہ سے منع ہے، امام مالکؒ کا مسلک اور زیادہ سخت ہے احناف تو تحریمہ کی اجازت معذور کے لئے غیر عربی میں بھی دیتے ہیں، لیکن

مدونہ میں ابوالقاسم کی روایت میں امام مالکؒ کی روایت ہے کہ وہ تحریمہ، دعا، اور قسم وغیرہ کو بھی غیر عربی زبان میں ادا کرنے کے قائل نہیں تھے، ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے رطانۃ اعاجم "عجمی لہجے سے منع فرمایا ہے اور کہا ہے، وہ عیب و فساد ہے (انہا خِبٌّ)۔

ان کا مسلک ہے کہ جمعہ کو چھٹی کا دن نہ بنایا جائے اس لئے کہ اس بے عملی میں یہود و نصاریٰ کی یوم السبت (شنبہ) اور (یکشنبہ) کی مشابہت ہے، اسی طرح وہ کسی کے لئے تعظیماً کھڑے ہونے کو مکروہ سمجھتے ہیں، البتہ بیٹھنے کے لئے جگہ دینا مستحب ہے۔

بعض اصحاب مالکؒ کا کہنا ہے کہ جو مشرکین کے کسی تہوار پر خربوزہ کو خاص طرح سے کاٹتا ہے وہ گویا خنزیر ذبح کرتا ہے، شافعیہ بھی اوقات مکروہ میں نماز کو حنفیہ کی طرح مکروہ کہتے اور اس کی علت مشرکین سے مشابہت کو قرار دیتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے "انہا ساعۃ یسجد لہا الکفار" (یہ کفار کے سجدے کی ساعت ہے) سحری کی تاخیر کی علت بھی اہل کتاب اور مسلمین کے درمیان فرق ہی کو کہتے ہیں، وہ اس سنت کے ترک کے بھی قائل ہیں، جسے اہل بدعت اپنا شعار بنالیں جیسے قبروں کو مخروطی بنانے کے بجائے وہ مسطح رکھتے تھے لیکن جب روافض کا یہ شعار بنا تو انھوں نے احناف اور حنابلہ کی رائے کو ترجیح دی۔

امام احمد کا مسلک اوپر گذر چکا ہے ان کا خیال ہے کہ مہینوں اور انسانوں کے عجمی نام بھی مکروہ ہیں، حنبلی فقہا میں قاضی ابو یعلی، ابن عقیل، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے لباس کے مسئلہ میں کہا ہے کہ عرب کو چھوڑ کر عجم کا وطیرہ اختیار کرنا مکروہ ہے،

شیخ اعظم حضرت جیلانیؒ کا ارشاد ہے "وتکرہ کل ما خالف زِیّ العرب وشابہ زیّ الاعاجم" علمائے حنابلہ کا (جن میں ابوالحسن آمدی (ابن البغدادی) بھی ہیں) کہنا ہے کہ ہاتھ دھونے کے لئے سلفچی کا استعمال مکروہ نہیں ہے، اس لئے کہ حضورؐ نے استعمال فرمایا ہے، حضرت شیخ جیلانیؒ نے فرمایا ہے کہ ایک ہی سلفچی میں سب کو ہاتھ دھلانا چاہیئے، اور حدیث میں آیا ہے کہ "جب تک طشت پانی سے بھر نہ جائے اٹھایا نہ جائے" علماء نے اس کی توجیہ میں کہا ہے کہ عجم کا طریقہ اس کے برخلاف تھا، علمائے حنابلہ نے (جن میں شیخ اعظمؒ بھی ہیں) سر منڈانے کو مکروہ لکھا ہے اس لئے کہ یہ بعض عجمی قوموں کا شعار ہے۔

اثرم نے امام احمد سے عجمی کمانوں کے لئے پوچھا تو فرمایا کہ اکثر لوگ تو عربی کمانیں ہی رکھتے تھے مگر حضرت عمرؓ سے رخصت بھی ثابت ہے، انھوں نے اہل خراسان کا یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ عربی کمانوں کو تیر بہدف نہیں سمجھتے، اس پر امام احمدؒ نے فرمایا۔ "کیف وانما فتحت الدنیا بالعربیۃ" (میں کیسے مان لوں؟ حالانکہ دنیا تو عربی کمانوں ہی سے فتح ہوئی ہے!)

اثرم نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ ایک دفعہ اپنی عربی کمان پر ٹیک لگائے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص ایرانی کمان لئے ہوئے گزرا آپ نے اس سے فرمایا کہ یہ ملعون کمان پھینک دو اور عربی کمان سنبھالو، اور نیزوں کو استعمال کرو، اللہ تعالیٰ اسی سے دین کی مدد کرے گا اور اسی سے تمہارے قدم جمائے گا" (فبھا یؤید اللہ الدین وبھا یمکن لکم فی الارض)

شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ جنگی آلات امور دنیا سے تعلق رکھتے ہیں جن میں

عقل و تجربے کا بھی کافی دخل ہوتا ہے لیکن ان چیزوں میں بھی ائمہ اور اسلاف احتیاط ہی سے کام لیتے تھے یہاں کتاب کے محشی شیخ حامد الفقی نے لکھا ہے کہ یہ تردد اور شروع میں حضور کی ممانعت اس لئے تھی کہ اہل عجم اسلحہ کی آرائش پر بھی زور دیتے تھے، لیکن آنحضورؐ ظاہر کو نہیں دیکھتے تھے، بلکہ ضرب کاری کو پسند کرتے تھے، اس لئے عربی اسلحہ کو پسند فرماتے تھے، لیکن آج جبکہ دوسری قومیں فنون حرب میں بہت آگے ہیں تو ہمیں اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ کے مطابق ان کے آلات و وسائل کو اپنا کر ان پر اضافہ بھی کرنا چاہیئے تاکہ اسلام کا کامیاب دفاع کیا جا سکے۔

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ شریعت نے کفار کی مشابہت سے اس لئے بھی روکا ہے کہ وہ شیطان کی مشابہت بھی ہوتی ہے، جیسا کہ مسلم نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے حضورؐ نے بائیں ہاتھ سے کھانا پینا منع کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شیطان کا عمل ہے۔

شیخ الاسلامؒ نے یہاں ایک حکیمانہ نکتہ سے ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اہل عجم کی مخالفت اور عرب کی موافقت، کا حکم کسی نسلی، نسبی، اور قومی عصبیت کی بنا پر نہیں دیا گیا ہے کیونکہ اسلام میں اس کا گزر نہیں۔ بلکہ اس لئے ہے کہ عرب اسلام کے نمائندے تھے، چنانچہ ان کی تہذیب اسلامی تہذیب میں رنگ گئی اور بالآخر اسلامی تہذیب میں جذب ہو گئی۔ اب اس کے بعد عرب کی مخالفت اسلامی تہذیب کی مخالفت کے ہم معنی ہو جاتی، لہٰذا اس سے روک دیا گیا۔

قبائلی عصبیت پر آنحضورؐ نے جس طرح ضرب کاری لگائی وہ سب کو معلوم ہے، صحیحین میں ابن العاصؓ کی روایت میں آپؐ نے فرمایا کہ فلاں میرے عزیز نہیں بلکہ میرا عزیز تو خدا اور اس کے نیک بندے ہیں"، ان بنی فلان لیسوا لی باولیاء انما ولیی اللہ وصالحوا المومنین"

خود اللہ تعالےٰ نے اہل عجم کی تعریف فرمائی فَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ"
(۶۲-۳) صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ یہ آیت اتری تو لوگوں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ آپ نے حضرت سلمانؓ پر ہاتھ دھر دیا اور فرمایا کہ اگر علم ثریا پر بھی ہو تو ان کی قوم کے افراد اسے اتار لائیں گے۔

عربوں سے مشابہت کا حکم انکی افضلیت کے سبب

شیخ الاسلامؒ نے اہل سنت کا عقیدہ یہ بیان کیا ہے کہ جنس عرب کو جنسِ عجم پر فضیلت ہے اس لئے کہ حدیث میں وارد ہے "حب العرب ایمان وبغضهم نفاق" (عربوں کی محبت ایمان، اور ان سے بغض نفاق ہے[1])۔
متعدد روایات میں عرب اور قریش وبنوہاشم کو مطلق فضیلت دی گئی ہے حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی روایت ہے "حب ابی بکرؓ وعمرؓ من الایمان وبغضهما من الکفر، وحب العرب من الایمان وبغضهم کفر (ابوبکرؓ وعمرؓ کی محبت ایمان اور ان سے بغض کفر ہے، اسی طرح عربوں سے محبت ایمان، اور ان سے نفرت کفر ہے) حضرت عمرؓ اور ان کے بعد تمام خلفائے بنو امیہ وبنی عباس..... عطیات کے رجسٹر میں پہلے آل رسولؐ، پھر عرب اور پھر عجم کے نام درج کرتے تھے[2]۔

---

[1] روایت ابو طاہر سلفی وحرب کرمانی۔ [2] حضرت عمر فاروقؓ نے جب وظائف کا نظم مقرر کیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ امیر المومنین اپنا نام پہلے تحریر فرمائیں اور اسی تناسب سے وظیفہ بھی قبول کریں لیکن حضرت عمرؓ نے دونوں باتیں قبول نہیں کیں، اور فرمایا کہ عمر کو اپنی حیثیت معلوم ہے اللہ نے اسے جہاں رکھا ہے اسے وہیں رہنے دو۔ لا۔ ولکن ضعوا عمر حیث وضعه الله تعالیٰ" چنانچہ اپنا نام بنی عدی کے ایک فرد کی حیثیت سے لکھا جنکا نام بنی ہاشم اور قریش کے بہت بعد درج رجسٹر تھا، اور اسی طرح معمولی وظیفہ بھی قبول فرمایا۔ منہ رح

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ اس فضیلت کی وجہ علم نافع اور عمل صالح ہے، اور علم کے لئے حفظ و فہم، اور نطق و بیان ضروری ہے اور ان دونوں چیزوں میں عرب اقوام عالم میں ممتاز ہیں، اور عمل کی بنیاد اخلاق پر ہے جو افتاد طبع اور مزاج سے پیدا ہوتے ہیں لہذا اس میں بھی عرب اس لئے ممتاز ہیں کہ ان کا رجحان خیر کی طرف زیادہ ہوتا ہے، اور ان کی سادہ فطرت خیر پسندی کی جانب آسانی سے مائل ہو جاتی ہے، اور ایک بڑی وجہ فضیلت یہ بھی ہے کہ دوسری تمام قومیں فطرت سے دور جا پڑی تھیں، اور ان کی سادہ طبیعت خود ساختہ تہذیب و تمدن سے غلط رنگ اختیار کر گئی تھی، ان کے علوم و فنون، ان کی خواہشات و نفسانی مطالبات نے آئینہ جاں کو مکدر اور شیشۂ دل کو گرد آلود کر دیا تھا —— لیکن عرب اپنی صحرائی اور بیابانی زندگی کی وجہ سے تہذیبوں کے زنگ، اور ان کے رنگ سے بچے ہوئے تھے، فطرت کی دی ہوئی تمام صلاحیتیں اور امکانات موجود تھیں لیکن کوئی ان کو صحیح رخ دینے والا نہ تھا، اس حال میں بعثت محمدی ہوئی اور رسول اللہؐ کی نگاہِ فیض پناہ نے "مس خام" کو کندن، اور "پتھر" کو "پارس" بنا دیا، تاہم شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ بہ حیثیت مجموعی عرب قوم کو فضیلت ہے نہ کہ ہر عرب کو فرداً فرداً عجمی پر فضیلت ہے نہ اس کو اظہار کا حق ہے اس لئے کہ یہ نسلی فخر و غرور کسی طرح اسلام میں جائز نہیں ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست!

شیخ الاسلامؒ نے ایک تاریخی غلطی کو صاف کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ عرب اور عجم کا امتیاز صرف حسب و نسب کا نہیں بلکہ علم و فن، اخلاق و آداب، اور تہذیب و ثقافت کے اختلاف کے سبب ہے، یعنی اس کی جڑیں صرف سطح پر نہیں بلکہ بہت گہری ہیں!

وہ "عربیت" کے لئے ۳ باتیں ضروری قرار دیتے ہیں، (۱) ان کی زبان عربی ہو (۲) عربوں کی اولاد سے ہوں (۳) ان کا مسکن جزیرۃ العرب ہو جس کے حدود بحر قلزم (RED SEA) سے خلیج عرب (ARABIAN GULF) اور جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام پر ختم ہوتے ہیں، لیکن اس میں شام، شامل نہیں، پھر فتوحات اسلامیہ کے بعد عالم اسلام کے دو حصے ہوئے، ایک وہ جن میں عربی تہذیب و ثقافت غالب تھی، دوسرے وہ جن میں مقامی رنگ زیادہ گہرا تھا۔

پہلے میں مصر و شام، عراق واندلس، ایران وخراسان رکھے جا سکتے ہیں، دوسرے میں ترکی، آرمینیہ، آذربیجان وغیرہ جیسے علاقے شامل ہیں، ان کی رائے ہے کہ عربوں کی تقلید کا یہی مفہوم ہے کہ ان کے دینی صفات اور اسلامی خصوصیات کی اتباع کی جائے جس کے لئے مثالی نمونہ اور معیار صدر اسلام کے عرب ہی قرار دیئے جائیں گے اس لئے کہ بعد کے آزاد خیال لوگ جو نسلاً عرب ہیں لیکن اخلاقی طور پر عرب نہیں ان کی تقلید ناروا ہے، صدرِ اسلام میں عربی معاشرت کی چھاپ سے کوئی شئے مستثنیٰ نہیں رہ سکتی تھی[1] حضرت حسینؓ کا قول تھا کہ جو عہدِ اسلام میں پیدا ہوا وہ عربی ہے، من ولد فی الاسلام فھو عربی (۱۶۸) اور حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک مرفوع روایت ہے کہ جو عربی بولتا ہے وہ عربی ہے، اور جس کے عہد اسلامی میں پیدا ہونے کی گواہی دو شخص دیدیں وہ بھی عربی ہے "من تکلم بالعربیۃ فھو عربی ومن ادرک لہ اثنان فی الاسلام فھو عربی"

---

[1] ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ "ہم نے اوپر عربی زبان اور عربی اخلاق کا ذکر کیا وہ اسی کے لئے ہے جو اس پر عامل ہو، اگرچہ نسباً وہ فارسی کیوں نہ ہو اور ہاشمی ہوتے ہوئے بھی جو ان صفات کا قائل نہیں وہ عربی نہیں، عربوں کی فضیلت دین ہی کے لحاظ سے ہے اگر کوئی عربی دیندار نہیں تو اس کے لئے فضیلت کا حکم نہیں" (۱۶۸)

امام ابو حنیفہؒ دو پشت کے عربی کو عرب کہتے ہیں، اور عرب کا کفو قرار دیتے ہیں، امام ابو یوسفؒ ایک ہی کو کافی سمجھتے ہیں، امام شافعی واحمد اسے معتد بہ نہیں سمجھتے، اس بحث کو شیخ الاسلامؒ نے ایک حدیث پر ختم کیا ہے کہ قیس بن مطاطہ نامی منافق نے ایک مجلس میں حضرات صہیب رومی، سلمان فارسی، اور بلال حبشی رضی اللہ عنہم کو طعنہ دیا کہ اوس وخزرج نے تو آنحضورؐ کے ساتھ جان کی بازی لگائی تھی لیکن ان کی قوموں نے کب ساتھ دیا تھا؟ حضرت معاذ بن جبلؓ کہیں سن رہے تھے، انھوں نے اسے پکڑ کر حضور کے پاس حاضر کیا آپؐ پر غصہ کے آثار ظاہر ہوئے اور نماز کا اعلان کرایا اور پھر منبر پر ارشاد فرمایا کہ لوگو رب ایک ہے، مورث اعلیٰ ایک ہے۔ دین ایک ہے اور عربیت رشتہ ونسب سے نہیں بلکہ یہ تو ایک زبان کی وجہ سے ہے، چنانچہ جو عربی بولتا ہے وہ عرب ہے، (یعنی اس میں کوئی فخر نہیں) حضرت معاذؓ نے پوچھا کہ اس منافق کے لئے کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا اسے جہنم میں جانے دو (دعہ الی النار) چنانچہ وہ کسی موقع پر مرتد ہوا اور مارا گیا۔[1] ایھا الناس ان الرب رب واحد، والاب اب واحد، والدین دین واحد، وان العربیۃ لیست لاحدکم باب ولا ام، انما ھی لسان، فمن تکلم بالعربیۃ فھو عربی“ ۱۶۹

---
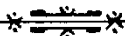
[1] ابن تیمیہ نے اسی حدیث کو سلفی سے نقل کیا ہے اور معنیً صحیح لکھا ہے۔

ماقبل اسلام مذاہب کے ساتھ اسلام کا رویّہ

[اسلام کے ناسخِ ادیان و ملل ہونے کو آج کل پھر غلط رنگ دینے کی کوشش ہو رہی ہے جس کا سلسلہ مستشرقین سے شروع ہوا تھا، کہا جاتا ہے کہ اسلام اتنا کٹر، اکھڑ اور اکل کھرا مذہب ہے کہ کسی مذہب و تہذیب کو پنپنے کا موقع ہی نہیں دیتا نہ اسے کسی طرح برداشت کر سکتا ہے، حالانکہ اس پروپیگنڈے کے پیچھے خالص تعصب کار فرما ہے اگر ایسا ہوتا تو اسلام ذمیوں کے ساتھ حسن سلوک بلکہ مساویانہ برتاؤ کی کیوں اجازت دیتا یا پرامن بقائے باہم کی شرطیں کیوں سامنے رکھتا؟ اس نے علم کی آزادی اس حد تک دی کہ چین تک کے علمی سفر کی اجازت دی، اور حکمت کو مومن کی متاع گم شدہ قرار دیا، اور جاہلیت کی اچھی اقدار کی قدر کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ جو جاہلیت میں شائستہ تھا وہ اسلام میں بھی رہے گا، خیرکم فی الجاھلیۃ خیرکم فی الاسلام۔

اسلام نے دوسرے مذاہب و تہذیب سے جن حدود کے اندر روکا ہے وہ اس لئے ہیں کہ عقلی اور اخلاقی اعتبار سے انسان کے لئے سود مند نہیں، یا پھر اس لئے کہ

دینِ کامل میں نقص کا سبب بن جاتے ہیں، اور ان سے اسلام کی انفرادیت پر حرف آتا، اور اس کے نظام کامل میں کوئی خلل واقع ہوجاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ ممانعت کسی تعصب کی بناپر نہیں بلکہ خود فلاح انسانیت کے پیش نظر ہے، ورنہ پھر آخری دین کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی، ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے مذاہب میں تاریخی نشیب و فراز کے ساتھ تحریف و تبدیلی ہوتی رہی ہے اس لئے ان کے حدود (LIMITS) مشتبہ ہوگئے اور ان کی جامعیت و مانعیت ختم ہو کر رہ گئی، اس بے یقینی کی کیفیت کو وہ رواداری کا نام دیتے ہیں، جسے اسلام جیسا متعین، مکمل، اور منظم مذہب ظاہر ہے کہ کیسے گوارا کرسکتا ہے یا کوئی بھی مذہب و تہذیب جس کا متعین نصب العین اور ہدف (GOAL) ہو اس کی کیونکر اجازت دے سکتا ہے]

شیخ الاسلامؒ ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ جن چیزوں کے بارے میں شریعت خاموش ہے ان میں ماقبل اسلام کے شرائع پر عمل ہوگا، اس لئے کہ ارشاد ہے "فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ" (۶:۹۱) (آپؐ اگلوں کا نمونہ سامنے رکھئے) دوسری جگہ کہا گیا "اِتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ" ۱۶: ۱۲۳ (ملت ابراہیم کی اتباع کیجئے) تیسری جگہ ارشاد ہوا "يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا" ۵ : ۴۴ (اطاعت گزاروں کو نبی اس کا حکم کرتے ہیں) عام سلف اور جمہور فقہا بھی اس کے قائل ہیں، اور سعید بن جبیر کی ابن عباسؓ سے روایت بھی اسکے ہم معنی ہے کہ حضورؐ نے مدینہ آکر عاشورا کے بارے میں یہودیوں سے دریافت فرمایا تو انھوں نے بتایا کہ یہ ہمارا بڑا دن (HOLY DAY) ہے جس میں حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی شکست کے بعد روزہ رکھا تھا، اس پر حضورؐ نے فرمایا تب تو ہم تم سے زیادہ کہیں موسیٰؑ کے حقدار ہیں چنانچہ

آپ نے روزہ رکھا اور صحابہؓ کو بھی حکم دیا۔ (متفق علیہ)

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ اہل کتاب سر کے بالوں کو سیدھا چھوڑ دیتے تھے، اور مشرکین مانگ نکالتے تھے، اور حضورؐ کا قاعدہ تھا کہ نامعلوم امور میں اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے، اس لئے آپ نے ایسا ہی کیا، مگر پھر بعد میں آپؐ نے فرق اقدس میں مانگ بھی نکالی۔ (متفق علیہ)

یہاں تک اعتراض تھا ابن تیمیہؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں اقتدا کا حکم وہیں ہے، جہاں ماقبل کی شریعت ثابت بھی ہو جیسے کتاب وسنت میں اس کا ذکر آیا ہو یا تواتر سے ثابت ہو اس کے بغیر براہ راست اہل کتاب کی کسی بات کو مان لینا صحیح نہیں، دوسرے آنحضورؐ کا معاملہ امت سے مختلف تھا آپؐ کو وحی کے ذریعہ اطلاع مل جاتی تھی لیکن امت کیونکر کسی گمراہی سے بچ سکتی ہے؟ اسی لئے آپؐ نے فرمایا کہ اہل کتاب کی تصدیق تکذیب کچھ نہ کرو، وہ کہتے ہیں کہ آنحضورؐ کی موافقتیں عارضی حکم کے طور پر تھیں مستقل اور دائمی نہ تھیں" وانما تجیٔ الموافقة فی بعض الاحکام العارضة لا فی الهدی الراتب والشعار الدائم" ۱۷۳۔

ایک اور ضروری چیز یہ ہے کہ ان احکام میں حضورؐ اور ان کے ساتھیوں سے کوئی بات اس کے خلاف نہ ثابت ہو چکی ہو، یا کم از کم اس کی اصل ہماری شریعت یا کسی نبی کی سیرت میں موجود ہو جیسے کسی نے بیٹے کی قربانی کی نذر مانی تو وہ جانور ذبح کر کے اسے پورا کر سکتا ہے جس کی اصل حضرت ابراہیمؑ سے ثابت ہے (ایک جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ اہل کتاب کی موافقت آپؐ نے خوشی سے نہیں کی بلکہ اس لئے کی کہ مشرکین کی موافقت نہ کرنا پڑے۔ گویا یہ اهون البلیتین کے اختیار کرنے کی صورت تھی

اسی لئے حدیث میں تصریح آئی ہے کہ مشرکین کے مقابلے میں اہل کتاب کے عمل کو ترجیح دیتے تھے نہ کہ مطلق حالت میں) صوم عاشورا کے بارے میں ان کی تحقیق ہے کہ وہ عربوں میں متعارف تھا چنانچہ حضورؐ اور قریش کے لوگ اسے رکھتے تھے حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہے کہ حضورؐ قریش کے رواج کے مطابق صوم عاشورا رکھتے تھے جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ عاشورا کے رکھنے نہ رکھنے کا اختیار ہے (صحیحین) ایک روایت میں ہے کہ عاشورا کے دن کعبہ پر غلاف ڈالا جاتا تھا "کان یوم تستر فیہ الکعبۃ" حضرت ابن عمرؓ سے بھی یہی روایت ہے۔

اہل کتاب کی موافقت کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ یہ پہلا حکم تھا، بعد میں اہل کتاب کی مخالفت کا حکم بھی ہوا اور اسے مقصد شریعت بھی قرار دیا گیا جیسے بالوں کے معاملے میں ان کی مخالفت کی اور ذمیوں کو مسلمانوں کے طرز پر مانگ نکالنے سے روک دیا گیا یا جیسے بیت المقدس کا قبلۂ اولیٰ منسوخ ہوگیا، صوم عاشورا میں یہود کی مخالفت کے خیال سے آپؐ نے ایک دن مزید روزہ کا حکم فرمایا تھا، جسے آگے پیچھے ملا لینا ضروری تھا۔

حکم بن الاعرج کہتے ہیں کہ میں ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ زمزم کے پاس چادر پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے، میں نے عاشورا کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ ۹ محرم کو بھی روزہ رکھو میں نے کہا کیا حضورؐ نے ایسا ہی کیا ہے؟ فرمایا: ہاں! مسلم میں ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اگر میں آئندہ سال تک جیتا رہا تو ۹ کو بھی روزہ رکھوں گا، ابن عباس نے فرمایا ۹ کو روزہ یہود کی مخالفت کے سبب رکھو سعید بن منصور نے سنن میں روایت کی ہے کہ حضورؐ نے بھی ایسا ہی فرمایا "صوموا یوم عاشوراء

وخالفوا فیہ الیھود صوموا یومًا قبلہ او یومًا بعدہ" امام احمد نے بھی یہی روایت کی ہے، اور ان کا مسلک بھی یہی ہے، حضرت ابن عباسؓ خالی عاشورا کے روزے کو مکروہ سمجھتے تھے۔

وہ فرماتے ہیں کہ صدرِ اسلام میں چونکہ یہودیوں اور مسلمانوں میں کوئی تہذیبی فرق نہیں تھا، اس لئے بعض چیزوں میں مسامحت کی گئی، لیکن جب دین کامل ہوگیا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں اجماعًا بھی اسلامی تہذیب کے حدود متعین ہوگئے تو مخالفت سامنے آئی جس کا سبب یہ تھا کہ یہ اضداد قسم کی چیز ہے، جو تہذیبی شوکت کے بعد ہی ظاہر ہوتی ہے، جیسے جہاد، جزیہ اور دوسرے احکام سیر۔ چونکہ مسلمان کمزور تھے، اس لئے مخالفت نہیں کی گئی، لیکن بعد میں ایسا نہیں رہا۔[1]

شیخ الاسلامؒ نے ایک قابل غور بات کہی ہے، جس پر حالات کے ردوبدل کے ساتھ عمل کیا جاسکتا ہے وہ فرماتے ہیں:

ومثل ذلك الیوم لو ان المسلم	مثلاً کوئی مسلمان اگر دار الحرب میں یا دار الکفر
بدار الحرب، او دار کفر غیر حرب	میں ہے تو وہ ظاہری مخالفت کا مامور نہیں
لم یکن ماموراً بالمخالفۃ لھم فی	اس لئے کہ اس میں نقصان کا اندیشہ ہے،
الھدی الظاھر لما علیہ فی ذلك	بلکہ کبھی مستحب اور کبھی واجب ہو جاتا ہے کہ
من الضرر بل قد یستحب للرجل	کبھی کبھار ظاہراً ان کے ساتھ ہو جائے مگر

[1] مگر صرف یہی نہیں کہ عدم مخالفت کی وجہ مسلمانوں کی کمزوری تھی، بلکہ اس کا سبب غالبًا یہ بھی تھا کہ جن احکام میں شریعت خاموش تھی، ان میں ایسا ہوا۔ اور دین کی تکمیل کے بعد دونوں کے تہذیبی حدود قدرۃً متعین ہوگئے اور دونوں نے ایک محاذ (FRONT) کی شکل اختیار کرلی۔ مرتب

او يجب عليه ان يشاركهم احيانا في هديهم الظاهر اذا كان في ذلك مصلحة دينية: من دعوتهم الى الدين والاطلاع على باطن امرهم لاخبار المسلمين بذلك او دفع ضررهم عن المسلمين ونحو ذلك من المقاصد الصالحة ـــــ ۱۷۷

یہ اسی صورت میں ہے کہ اس میں کوئی دینی مصلحت ہو جیسے دین کی دعوت یا ان کا اور ان کی تہذیب و تمدن، اور سیاست و حکومت کا جائزہ لینا مقصد ہو جس سے دفاعی کاموں میں مدد ملنے کی امید ہو، یا مسلمانوں کی کسی افتاد سے حفاظت کی توقع ہو تو ایسی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اور دوسرے صالح مقاصد کے لئے بھی یہ طریقہ کار اپنایا جا سکتا ہے۔

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اصل اظہار مخالفت اسلامی مملکت میں ہوگا جہاں اس کا حق حاصل ہے اور ہر قسم کا تحفظ بھی موجود ہے[1]۔ وہ فرماتے ہیں کہ دین کے معاملے میں اہل کتاب کے کسی قول و فعل کو اختیار کرنا جائز نہیں، اور اگر کوئی کہتا ہے کہ ہمیں اہل کتاب کی ضرور موافقت کرنی چاہیئے۔ تو اس کے دین سے نکل جانے کا اندیشہ ہے، البتہ سلف جن باتوں میں اہل کتاب کی موافقت کرتے

---

[1] یہ مخالفت بغض للّٰہی نہیں، بلکہ یہ صرف تہذیبی امتیاز کے لئے ہے کہ کفر و اسلام دونوں کی پیدا کردہ تہذیبیں دنیا کے سامنے بے نقاب رہیں، اور لوگوں کو آزادانہ رد و قبول کے لئے مواقع فراہم ہوں اور وہ دونوں کی خوبیوں اور خرابیوں کا جائزہ لے سکیں۔ دوسری حکمت یہ تھی کہ ذمیوں کا تہذیبی استحصال موقوف ہو ان پر زبردستی اسلامی تہذیب کو نہ لادا جائے۔ ش

نظر آتے ہیں، خواہ وہ شعوری طور پر ہوا ہو، یعنی شرعی جواز کے تحت ہو یا خود اہل کتاب ہی اس کی اتباع کرنے لگے ہوں تو ہم سلف کی اتباع سمجھ کر اہل کتاب کی موافقت میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، لیکن غیر شعوری طور پر بھی غیر مسلمین کی تقلید و موافقت ناروا ہے، اس لئے کہ بالوں کی سفیدی یا مونچھوں کا بڑھ جانا ایک فطری بات ہے جس میں اہل کتاب وغیرہ سے مشابہت و موافقت میں قصد و ارادہ کا کوئی دخل نہیں لیکن آنحضورؐ نے ان کو بھی گوارا نہیں کیا، اور ان کے لئے علیحدہ حکم دیا، انھوں نے اہل کتاب کے مسائل کی تین قسمیں کی ہیں، ایک یہ کہ وہ ہمارے ہاں مشروع ہو اور ان کے ہاں بھی ہو یا وہ عمل کرتے چلے آئے ہوں، دوسری یہ کہ مشروع ہو لیکن بعد میں قرآن نے اسے منسوخ کر دیا ہو تیسری یہ کہ وہ ان کی شریعت میں نہ ہو بلکہ ایجاد بندہ اور بدعت ہو، پھر یہ تینوں قسمیں عبادات سے متعلق ہوں گی یا عادات سے یا دونوں سے اس طرح ان کی ۹ قسمیں ہو جاتی ہیں۔

پہلی صورت جس میں شریعت اسلامی اور وہ دونوں متفق ہوں جیسے صوم عاشورا یا صلاۃ و صیام، تو ان کی صفات میں اختلاف ضرور ہوگا جیسے دسویں کے ساتھ نویں کا روزہ، یا افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر وغیرہ جیسے اختلافات عبادات میں زیادہ اور عادات میں کم ہیں۔

تدفین دونوں میں مشترک ہے، لیکن آپ نے فرمایا ہمارے لئے لحد ہے اور دوسروں کے لئے شق، یا ننگے پاؤں نماز پڑھنا شریعت موسوی کی ہدایت تھی، لیکن اسلام میں ایسا نہیں، حائضہ سے علیحدگی ان میں بھی تھی لیکن

اسلام نے اس میں اعتدال پیدا کر دیا۔

دوسری قسم یعنی ان کی منسوخ شریعت جیسے سبت وغیرہ میں تو موافقت کا کوئی سوال ہی نہیں، اور یہی حکم تیسری قسم یعنی بدعت کا بھی ہے۔
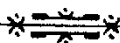
غیر اسلامی تقریبات عیدوں اور تیوہاروں میں شرکت

[اسلام میں غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت سے جو روکا گیا ہے وہ بلا وجہ اور بے ضرورت نہیں، اس میں کئی مصالح اور مضرات ہیں، ایک مسلمان کو ایسی تقریبات اور تیوہاروں میں جانے سے سب سے پہلی چیز جو روکتی ہے، وہ ان تیوہاروں کا مذہبی، مشرکانہ اور مخالف اسلام ہونا ہے، یعنی ان میں شرکت کے معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ توحید کے علم بردار کفر و شرک کے تماشوں اور نمائشوں میں دلچسپی لیں، اور ان رسوم سے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچائیں، آج کل کی جو زبانی رواداری چلی ہے (جس میں دل میں نفرت کے ساتھ زبان پر دوستی کے دعوے ہوتے ہیں، اور حالتِ جنگ میں بھی ایک دوسرے کی مزاج پرسی کی جاتی ہے) اس کا محرک لا مذہبی ذہن اور اباحت پسندانہ مزاج ہے۔ ایسے "روادار" لوگ مذہب کی صحیح روح ہی کو نہیں سمجھتے اور نہ اس کی تعلیمات کی عقیدہ و عمل سے تصدیق کرتے ہیں، ان کے یہاں مذہب کے متعین حدود اور قانون کا تصور ہی نہیں، ان کے یہاں کفر و ایمان، شرک و توحید اور

دیر و حرم سب ایک ہی ہیں۔ ان میں کوئی فرق و امتیاز نہیں، ایسے لوگ آج کے معاشرہ میں بڑے روادار سمجھے جاتے ہیں لیکن یہی "رواداری" مذاہب کی زندگی کے لئے اصل چیلنج ہے، رواداری کے بھی حدود ہوتے ہیں، تیوہار اور تقریبات، صرف اظہار خوشی اور تفریح کے لئے نہیں ہوتیں بلکہ ان کی بنیاد ہمیشہ اور تاریخ کے ہر دور میں مذہب و عقیدہ پر قائم رہی ہے، کسی بھی قوم کی تقریبات کا تاریخی پس منظر دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی مذہبی روایت یا عقیدہ کارفرما رہا ہے، انگریزی مہینے آج کل ہر جگہ استعمال میں ہیں، اسی طرح دِنوں کے انگریزی نام سب کی زبان پر ہیں، لیکن ان تک میں رومی، یونانی، اور مسیحی عقائد کا پسِ منظر موجود ہے، قدیم اقوام حتی کہ قبائلی نظام میں بھی مذہب و عقیدہ کی بنیاد پر رسمیں، اور تیوہار منائے جاتے تھے، یونانی، رومی، یہودی، مسیحی، اور ہندو تہذیبوں میں بھی شاید ہی کوئی تقریب اور تیوہار ہو جو کسی مذہبی روایت اور حکم کی بنا پر نہ منائی جاتی ہو۔ اس صورت حال کے پیش نظر اسلام کس طرح مسلمانوں کو جو ایک خاص خالص عقیدہ کے حامل ہیں، ان مذہبی تقریبات کی شرکت کی اجازت دیدیتا، یہ تضاد تہذیب جدید کی نئی منطق میں جائز ہو تو ہو، اسلام کی واضح تعلیمات میں اس کی جگہ نہیں یہاں غیر اسلامی تقریبات کے بارے میں کچھ بیانات دئے جا رہے ہیں، تاکہ ان کے پس منظر کا ایک اندازہ ہو سکے۔ "قاموس مذہب و اخلاق" کے مقالہ نگار نے تقریبات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:۔

"قبائل میں غذا کی فراہمی کی بڑی اہمیت رہی ہے، بونے، کاٹنے، اور شکار کے موسم ہمیشہ خوشی کے موقعے سمجھے گئے ہیں، جن میں سخت محنت

کے بعد جشن منانا ایک فطری ضرورت سمجھی گئی، یہ مواقع روحانی اثرات سے پُر سمجھے جاتے تھے، ان میں دعوت ایک اہم جز ہوا کرتی تھی گویا یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان دعوتوں میں دیوتاؤں کو شریک کر رہا ہے، اس کے علاوہ کئی اور مواقع بھی اسی قسم کے تیوہاروں کے لئے مخصوص کئے جاتے رہے ہیں، مثلاً نئے چاند کا دکھائی دینا، یا مختلف دیوتاؤں سے متعلق تیوہار، عام طور پر ان موقعوں پر ناچ گانے کے ذریعہ خوشی کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔

قدیم قبائل میں مختلف دیوتاؤں کے نام پر تیوہار منانے کی رسم ہمیشہ پائی جاتی رہی ہے جس میں دعوت ایک لازمی جز ہوا کرتی ہے، اعلیٰ مذاہب میں بھی دیوتاؤں یا ان سے تعلق رکھنے والے مواقع پر تیوہار اور دعوت کا رواج رہا ہے، گویا اس طرح دیوتاؤں کی عزت افزائی اور ان سے اظہارِ تواضع کیا جاتا رہا ہے۔

تمام ہندو تیوہار مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا ذکر بھی مذہب سے متعلق کتابوں میں ملتا ہے، اس میں دیوتا کے سامنے نذر پیش کرنے یا اس سے متعلق کسی رسم کو پورا کرنے کے سلسلے میں زیادہ تیوہار منائے جاتے ہیں، عوامی تیوہاروں میں بھی دو جز ہوتے تھے، ایک دعوت دوسرے پوجا، پرانے موسمی تیوہاروں میں "پورنماشی" کی خاص اہمیت ہے، نہ صرف یہ کہ وہ بہت قدیم تیوہار ہے بلکہ مقبول ترین بھی ہے، بدھسٹ بھی اس کو (UPASATHA) کے نام سے مناتے تھے، اس کا ایک جز

نذر اور پوجا بھی تھا، موسمی تیوہاروں میں ہر چوتھے مہینے ایک تیوہار ہوتا تھا، ایک جاڑے کے ختم پر دوسرا موسم بہار کے شروع میں، تیسرا آغاز برشگال پر۔ ان سب میں کسی نہ کسی دیوتا کی پوجا ہوتی اور بکرا یا بھیڑ قربان ہوتی ________ بعض تیوہاروں کا دریاؤں اور گھاٹوں سے تعلق رہا ہے، جو یاتریوں کے اشنان اور اجتماع کے موقعے بن جاتے تھے، پرانی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مواقع اجتماع سیکڑوں تھے، جن میں دیوتاؤں کو نذریں پیش کرتے تھے ________ ہولی، موسم بہار سے متعلق ہے، اس میں دیوتاؤں کے جلوس نکالتے تھے اور یہ اظہار خوشی کا خاص موقع سمجھا جاتا تھا۔ مذہبی قانون اس تیوہار میں ضرورت سے زائد چھوٹ دیتا ہے ناچ گانا، الاؤ لگانا، رنگ کھیلنا اس کے اجزا ہیں۔ پوری میں "ہولی یاترا" میں جگن ناتھ کا جلوس نکلتا ہے۔"[1]

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:۔

"تقریباً تمام بڑے مذاہب کی اپنی تقویم ہوتی ہے اور الگ سال ہوتا ہے جس سے مذہب کے مقدس مواقع متعلق ہوتے ہیں، مثال کے طور پر عیسائیوں کا مقدس سال حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بعد شروع ہوتا ہے، زرتشتیوں کا نیا سال اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ وقت کا تعین کب شروع ہوا۔ عام تاثر یہ ہے کہ اس مذہب کے متعلق نئے سال کو

ENCYCLOPEDIA OF RELIGION & ETHICS (VOL. 5 P. 868 ED. 1912) [1]

پیدا کر کے خدا نے اس کے ماننے والوں کے لئے وقت کا تعین کیا ہے، ان قدیم ترین مذاہب میں تیوہاروں کا تعین ان کے سال سے اور سالوں کا تعین ان کے قدیم دیو مالا سے اتنا خلط ملط ہے کہ دونوں کو جدا کرنا ناممکن ہے، ان تیوہاروں کا تصور دراصل قبیلوں کی قومی شیرازہ بندی کرتا ہے تیوہاروں کے موقع پر زندوں کا مردوں سے تعلق قائم کرنا اور دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا ہمیشہ سے اہم جز رہا ہے، یونانی اور بابلی مذاہب میں اکثر تیوہاروں کے موقع پر اس شہر کی پوجا کی جاتی تھی جس نے بعد میں وسعت پا کر پوری مملکت کے لئے اظہار وفاداری کی شکل اختیار کر لی۔

دراصل کسی مذہب کے تیوہاروں کی تاریخ سے اس مذہب کی پوری تاریخ کا پتہ چلایا جا سکتا ہے، مثال کے طور پر عیسائیوں کا ——— (ALL SAINTS DAY) "یوم صوفیاء" قدیم شمالی یورپ میں مروج روحوں کی پرستش سے ماخوذ ہے، تھائی لینڈ کے نئے سال میں یہ تقریبات کے ساتھ ساتھ قدیم ہندو رسم و رواج کی جھلک دکھائی دیتی ہے... اور سکھوں کا تیوہار "ہولا" ہولی سے مشتق ہے، تیوہاروں کے مذہبی، سیاسی، اور مقامی روایات کو الگ نہیں کیا جا سکتا، اور یہ تمام دھارے مذہبی تقریبات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، قدیم ترین قبائل میں جزائر فیجی کے جنگلی قبائل اپنے نئے سردار کی رسم تاجپوشی اس طرح مناتے ہیں کہ اس دن دنیا کی نئی تخلیق ہوئی ہے فصل کٹنے کے وقت عام دعوت میں مردہ روحوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے اور

انھیں ناچ گا کر خوش کیا جاتا ہے، اسی طرح دوسرے قدیم قبائل میں فصل کی بوائی، کٹائی، شکار کا موسم شروع ہونے، درختوں میں پھل آنے کے وقت مختلف تیوہاروں کا رواج ہے جن کا بڑا عنصر مذہبی تقریبات ہیں، قدیم بابلی تہذیب میں مذہب کا سب سے بڑا تیوہار آغاز سال تھا، جس میں بادشاہ وقت کی شادی (ISHTAR) دیوی سے کر کے دنیا پر دیوتاؤں کی حکومت کا شگون لیا جاتا تھا۔

قدیم مصری مذہب میں تیوہاروں کے موقع پر پجاریوں کو اہم تقریبات ادا کرنا ہوتی تھیں، جن میں دیوتاؤں کو کھلانا، ان کی آرائش، اور ان کے جلوس شامل تھے، ان کا سب سے بڑا تیوہار (OPET) کہلاتا تھا، جس میں عموماً دیوتا (AOMON) کی مورتی کو کشتی میں سجا کر حکومت وقت اقصر (LUXOR) سے کرنک (KARNAK) لیجاتا تھا، قدیم یونانی مذاہب میں تیوہاروں کا تعلق زراعت سے تھا، اور ان کا خاص جز دیوتاؤں کی پوجا، دعوت عام، ناچ گانے اور کھیل تماشے تھے، قدیم رومی مذہب کا بھی تقریباً یہی حال تھا، (MARS) کا تیوہار جنگ کے دیوتا کی یاد میں منایا جاتا اور (SATURN) کا تیوہار فصل کٹنے کے موقع پر جبکہ تمام سماجی پابندیاں ڈھیلی کر دی جاتیں اور لوگوں کو پوری آزادی دیدی جاتی تھی، اگرچہ یہ تیوہار، زیادہ تر بت پرستی کی یادگار تھے، لیکن ہر شہری کی وفاداری کا یہ تقاضا سمجھا جاتا تھا کہ وہ ان میں پوری طرح حصہ لے۔

قدیم ایران کے دو تیوہاروں میں سے ایک نوروز تھا، جو سال نو کی آمد پر منایا جاتا اور دوسرا مہرجان جو زرتشت کی پیدائش کے موقع پر آتا، اس کے علاوہ چھ موسمی تیوہار جو آسمانوں، پانی زمین، درخت، جانور اور انسان کی تخلیق سے متعلق تھے، ان میں سے ہر تیوہار ۵ دن تک منایا جاتا تھا، جنوب مشرقی ایشیا کے بدھسٹ ممالک میں منائے جانے والے تیوہار نہ صرف بدھ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، بلکہ ان پر قدیم ہندو رسم و رواج کی چھاپ بھی دکھائی دیتی ہے، سال نو (TRUT) کے موقع پر بھکشو، بد روحوں کو بھگاتے ہیں، مختلف دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی ہے جن کا تعلق قدیم ہندو دیوتاؤں سے معلوم ہوتا ہے، ایک دوسرے پر پانی ڈالتے ہیں، اور تین دن تک جوا کھیلا جاتا ہے، اسی طرح بدھ کی پیدائش بیساکھ کے مہینے میں چندر ماشی کی رات کو (VISHAKHA) پوجا کے نام سے منایا جاتا ہے، ہندوؤں کے زیادہ تر تیوہاروں کا تعین موسم کی رعایت سے کیا گیا ہے، دو تیوہار جن کا ذکر ویدوں میں ملتا ہے، جاڑے کے اخیر میں، بارش شروع ہونے، نیز موسم بہار کے موقع پر منائے جاتے تھے، قدیم ویدک تیوہار ان آریائی تیوہاروں سے بہت مماثل تھے، جنھیں انڈو یورپین آریا مناتے تھے، لیکن ہندستان میں دراوڑا قوام کے ساتھ اختلاط کے بعد ویدک تیوہار رفتہ رفتہ ختم ہو گئے اور ان کی جگہ موجودہ ہندو تیوہاروں نے لے لی۔[۱]

---

[۱] ENCYCLOPEDIA BRITANNICA, VOL. 9 P. 125-28 (ED. 1965)

ایڈورڈ گبن اپنی "تاریخ زوالِ روما" میں لکھتا ہے :-

"مومن کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے ہر چہار طرف خطرات کی یلغار تھی، اور تیوہاروں کے موقع پر تو یہ آزمائشیں باعث زحمت بن جایا کرتی تھیں اور قدم قدم پر ان کا سامنا پڑتا تھا کیونکہ یہ اوہام پرستیاں اور باطل عقائد کبھی خوشی اور مسرت کا لباس پہن کر سامنے آتے اور کبھی نیکی اور بھلائی کا روم کے مقبول ترین تیوہاروں کے موقع پر کھلے عام اظہار عقیدت، مردہ روحوں کے ذکر اذکار، موسم بہار کے آنے کی خوشی تخلیقی قدرت کی پرستش، شہر روم کا جشن بنیاد اور نیز جمہوریہ سے اپنی وفاداری کا اعلان ہوتا تھا، ان موقعوں پر عیسائی جس طرح اپنے کو الگ تھلگ رکھتے تھے، اس سے ان شرک آمیز رسوم سے نفرت کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے تیوہاروں کے موقع پر یہ عام رسم تھی کہ دروازوں کو چراغوں اور ٹہنیوں سے سجایا جاتا اور سروں پر پھول کے گجرے لپیٹے جاتے، بظاہر یہ ایک بے ضرر چیز اور اظہار مسرت کا ایک قدرتی طریقہ معلوم ہوتا ہے، لیکن بدقسمتی سے دروازوں کو اس لئے سجایا جاتا تاکہ انکی پاسبانی کرنے والے دیوتا خوش ہوں، سروں پر گجرے اس لئے لپیٹے جاتے کہ پھولوں کے گجرے دیوی (DAPHNE) کے عاشق کو عزیز تھے، اور غم و خوشی کے موقع پر ان کا استعمال اسی اوہام پرستی کا نتیجہ تھا۔

ایمان کو عزیز رکھنے والا عیسائی جسے اکثر اپنے ملک کے دستور کے مطابق، یا حکام کے احکام کی پابندی میں ان رسوم کی پابندی کرنا پڑتی

اپنے ضمیر کے خوف، چرچ کی ملامت، اور خدائی قہر کے ڈر سے لرزہ براندام رہتا تھا۔"[۱]

علامہ ابن تیمیہ کی رائے ہے کہ غیر اسلامی تقریبات میں شرکت کسی طرح جائز نہیں، ان کا استدلال واستنباط (INFERENCE) تابعینؒ کی ان تصریحات پر مبنی ہے، جو انھوں نے "وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا" ۲۵: ۷۲ کی تفسیر میں لکھی ہیں۔ انھوں نے "زور" میں غیر مسلموں کی تقریبات کو بھی مراد لیا ہے، ابوبکر الخلال نے جامع میں محمد بن سیرینؒ سے نقل کیا ہے کہ "زور" عیسائیوں کی عید "شعانین" ہے، مجاہدؒ کہتے ہیں "ھو اعیاد المشرکین" یہ مشرکوں کی عید کو کہتے ہیں، ربیع بن انسؒ بھی یہی رائے رکھتے ہیں، عکرمہؒ فرماتے ہیں: "لعب کان لھم فی الجاھلیۃ" (یہ ایک جاہلی کھیل تماشہ تھا) قاضی ابویعلیٰ بھی اس سے عیدِ کفار ہی مراد لیتے ہیں، ابوشیخ اصفہانی نے ضحاکؒ سے بھی یہی رائے نقل کی ہے لیکن ابوسنان نے ان کی رائے کلام جاہلیت کے بارے میں نقل کی ہے، عمرو بن مرہ سے انھوں نے اس کا مطلب عیدوں میں شرکت نقل کیا ہے، اور عطاء بن یسارؒ سے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ "ایاکم ورطانۃ الاعاجم وان تدخلوا علی المشرکین یوم عیدھم فی کنائسھم" (نہ عجمی زبان بولو اور نہ ان کی عید کے دن غیر مسلم عبادت گاہوں میں جاؤ)

علامہؒ نے لکھا ہے کہ مفسرین کے اس باب میں مختلف اقوال آئے ہیں، وہ

---

[۱] GIBBON: DECLINE & FALL OF THE ROMAN EMPIRE VOL. 2 P. 18 (LONDON -1909)

دراصل مختلف نہیں بلکہ اصلاً ایک ہی حقیقت کے مختلف پیرایۂ بیان ہیں، جو انھوں نے مخاطب کے حالات کے پیش نظر جواب میں دیئے، کوئی گانے کا شائق تھا تو اسے کہا کہ اس کا مطلب یہی ہے کوئی تماشا پسند تھا تو اسے بتایا کہ اس کا مطلب میلے ٹھیلے ہیں، جن میں حاضری اس آیت سے منع ہے، البتہ بعض مفسرین نے اس کا مطلب جھوٹی گواہی سے بھی لیا ہے، لیکن ابن تیمیہ اس کو نحوی ترکیب کے اعتبار سے غلط سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ شہادت کا صلہ 'ب' سے آتا ہے اس لئے "بالزور" ہونا چاہیئے تھا، اور ایسا نہیں ہے تو وہ حضوری کے معنی میں ہے، جیسے ابن عباسؓ کہتے ہیں، "شھدت العید مع رسول اللہ ﷺ" (میں عید میں حضور کے ساتھ گیا) حضرت عمرؓ نے فرمایا: "الغنیمۃ لمن شھد الوقعۃ" (غنیمت اس کے لئے ہے جو محاذ پر رہا ہو) لیکن اس خیال کے مفسرین کے لئے بھی اس طرح گنجائش ہے کہ زور میں خلاف واقعہ ہونا دونوں میں مشترک ہے، اس کے بعد وہ اس آیت پر رائے دیتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے عیدوں میں تماش بینی اور حاضری منع کر دی تو عملاً انھیں منانا کہاں جائز ہو سکتا ہے؟ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ آیت کا غالب مفہوم بھی یہی عملی طور پر عیدوں کا منانا ہی ہے جیسے قول زور (جھوٹ اور دوسری تمام غلط باتوں) سے روکتے ہوئے کہا گیا "اِنَّهُمْ لَيَقُولُونَ مُنكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُورًا" ۵۸ : ۲

احادیث میں امتناعی احکام

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضور سرور عالم جب مدینہ تشریف لائے تو سال میں دو دن جاہلی عید کا رواج دیکھا دریافت کرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

نے تمہارے لئے اس سے بہتر دو عیدیں مقرر کی ہیں (ابو داؤد، احمد، و نسائی)

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں تبدیلی کا لفظ بتاتا ہے کہ جب یہ دو نئی عیدیں جاہلی عیدوں کی جگہ مقرر ہوئیں تو وہ عیدیں خود بخود منسوخ ہو گئیں اور منسوخی کے بعد پھر ان میں شرکت کا مطلب اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی ہی ہو گی۔

وہ فرماتے ہیں کہ جاہلی عیدوں کا خاتمہ بتاتا ہے کہ آنحضورؐ نے سختی کے ساتھ اس حکم پر عمل درآمد کرایا ہو گا، ورنہ اس کے بغیر پرانی روایت کا یکسر ترک کر دینا انسانی فطرت کے خلاف ہے ابو داؤد میں ثابت بن ضحاکؓ کی روایت ہے کہ عہد نبوی میں کسی نے نذر مانی کہ وہ بوانہ[1] کے پاس ایک اونٹ ذبح کرے گا چنانچہ حضورؐ سے جب اس نے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ یہاں کوئی بُت تو نہ تھا؟ لوگوں نے کہا نہیں! پھر پوچھا کوئی جاہلی عید تو منعقد نہیں ہوتی تھی؟ لوگوں نے عرض کیا نہیں! تب فرمایا اپنی نذر پوری کرو اس لئے کہ صرف وہ نذر نہیں پوری کرنا چاہیئے جس میں معصیت ہو اور وہ جو ابن آدم کے اختیار سے باہر ہو (صحیحین)

ابو داؤد میں میمونہ بنت کردم کی روایت ہے کہ میں حج میں حضورؐ کے ساتھ تھی حضور کو میں نے ایک اونٹ پر سوار دیکھا اور آپ ہاتھ میں معلّمین کی طرح کا دُرّہ لئے ہوئے تھے۔ میرے والد نے قریب جا کر پائے مبارک تھام لیا اور عرض کیا کہ حضورؐ! میں نے نذر مانی تھی کہ اگر میرے ہاں اولاد نرینہ پیدا ہو گئی تو بوانہ میں چند اونٹ ذبح کروں گا آپ نے یہ معلوم کر کے کہ وہاں کوئی بت نہیں، انھیں ایفائے نذر کا حکم دیا، ابو داؤد ہی میں

---

[1] بوانہ مکہ معظمہ کے قریب ینبع کے پاس ایک جگہ ہے جس کے متعلق وضاح الیمن کہتا ہے:

ایا نخلتی وادی بوانۃ حبذا ‏ ‏ اذا نام حراس النخیل جناکا

عمرو بن شعیب کی روایت ہے کہ ایک عورت نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے آپ کے پاس دَف بجانے کی نذر مانی تھی، آپ نے فرمایا نذر پوری کرے پھر اس نے کہا کہ میں فلاں مقام پر قربانی بھی کرنا چاہتی ہوں آپ نے اطمینان کرنے کے بعد اس کی بھی اجازت دیدی۔ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ جب جاہلی میلوں اور عبادت گاہوں پر کسی عقیدتمندانہ حاضری کو منع کر دیا گیا تو خود جاہلی عیدوں میں شرکت بدرجۂ اولیٰ ممنوع ہو گی۔

[عید "عود" سے نکلا ہے جس کا مطلب لوٹنا اور بار بار آنا ہے، عید کو عید اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ ہر سال آتی ہے متنبی کہتا ہے:-

عیدٌ بایۃ حال عدت یا عید
بما مضیٰ؟ ام لامرٍ فیک تجدید؟]

عید میں اجتماعی اور عوامی میلہ کی کیفیت بھی ضروری ہے جیسے لوگ سال، مہینہ ہفتہ میں مناتے ہوں، جمعہ کے لئے حضورؐ نے فرمایا کہ اسے اللہ نے مسلمانوں کے لئے عید کا دن بنایا ہے، عید اجتماع اور عبادات و اعمال کے لئے بھی آتا ہے، جیسے ابن عباسؓ کہتے ہیں: میں حضور کے ساتھ عید میں حاضر ہوا" اور کسی خاص مکان کے لئے بھی آتا ہے، جیسے حضورؐ نے فرمایا، میری قبر کو عید نہ بنانا، اور کبھی سب کے لئے ایک ساتھ بولا جاتا ہے، جیسے حضورؐ نے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا،" ابو بکرؓ انھیں گانے دو ہر قوم کے لئے عید ہوتی ہے، اور یہ ہماری عید ہے"

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ بعض جاہلی عیدیں اور عید گاہیں ایسی بھی تھیں جو مذہبی نہیں تھیں، بلکہ کھیل تماشوں اور میلوں کی جگہیں تھیں، لیکن آپ نے ان سے بھی

روک دیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کی چھاپ لگی ہوئی کوئی چیز حدودِ اسلامی میں سکہ رائج نہیں بن سکتی۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ عید کے دن میرے ہاں دو بچیاں کچھ گا رہی تھیں کہ اتنے میں میرے والد تشریف لائے اور اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ ان سے درگزر کرو، ہر قوم عید مناتی ہے اور آج ہماری عید ہے"۔ ایک روایت میں ہے" دعهما یا ابا بکر، فانها ایام عید وتلك الایام ایام منی"۔ (ابوبکر! چھوڑ دو بھی۔ یہ عید کے دن ہیں، اور یہ دن حج و قربانی کے دن ہیں)۔

شیخ فرماتے ہیں کہ حدیث میں ہے:" ان لکل قوم عیدًا"، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے قرآن میں کہا گیا:

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا (۲:۱۴۸) ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے جس کا وہ رخ کرتا ہے۔

یا جیسے ارشاد ہوا:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا۔ (۵:۴۸) ہم نے سب کے لئے شریعت و طریقت بنائی ہے۔

یہ فلسفۂ تاریخ کے مسلمات میں داخل ہے کہ ہر قوم ایک ممتاز تہذیبی خصوصیت کی حامل اور مخصوص طرزِ زندگی پر عامل رہی ہے، اس لئے جس طرح ہم غیروں کے دین و شریعت میں شریک نہیں، تہذیبی شعائر میں حصہ دار نہیں، اسی طرح ان کی عیدوں، میلوں اور تیوہاروں سے بھی ہمیں الگ رہنا ہے، حدیث میں "ھذا عیدنا" (یہی ہماری عید ہے) کا جملۂ حصر بتاتا ہے کہ اس کے سوا ہمارے لئے اور کوئی عید نہیں۔

حدیث میں ارشاد ہوا:

یوم عرفۃ، و یوم النحر، و ایام منیٰ	یوم عرفہ یوم قربانی اور ایام تشریق ہم
عیدنا اھل الاسلام وھی ایام اکل	اہل اسلام کی عید کے اور کھانے پینے کے
وشرب" (ابوداؤد، نسائی، ترمذی)	دن ہیں۔

شیخ الاسلام نے ایک تاریخی حقیقت سے استدلال کیا ہے کہ جزیرۃ العرب میں یہود و نصاریٰ اور دوسری قومیں آباد تھیں اور قومی پیمانے پر اپنے تیوہار بھی مناتی تھیں لیکن آنحضرتؐ کے حکم کے بعد کوئی مسلمان کبھی ان تیوہاروں سے متعلق نہیں ہوتا تھا، اس سے یہ بات قطعۃً طے ہو جاتی ہے کہ جب صدر اسلام میں غیر اسلامی تقریبات سے علیحدگی ہی اختیار کی گئی تو وہی طرزِ عمل آج بھی ہمارے لئے نمونہ رہے گا۔

اگر ان تقریبات میں کسی مسلمان کا تفریحاً جانا ثابت بھی ہے تو وہیں یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف حکم امتناعی جاری کیا تھا۔

فجر اسلام میں کس طرح مسلمانوں کے ذہنوں میں انکی قومی عید کا تصور بٹھایا گیا اس کا اندازہ دو حدیثوں سے ہوگا، صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

نحن الآخرون السابقون یوم القیامۃ	ہم آخر میں ہو کر بھی اول رہیں گے سوا اس کے
بید انھم اوتوا الکتاب من قبلنا واوتیناہ	کہ انھیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی، لیکن
من بعدھم فھذا الیوم الذی	جمعہ کے دن میں انھوں نے اختلاف کیا
فرض اللہ علیھم فاختلفوا فیہ	اور اللہ نے ہماری صحیح رہبری کی اس لئے
فھدانا اللہ لہ فالناس لنا فیہ	لوگ اس معاملے میں ہمارے تابع ہیں،

تبع: الیهود غداً والنصاری بعد غد	یہودی سنیچر کو اور عیسائی اتوار کو یوم جمعہ سمجھ بیٹھے

دوسری روایت:

اضل اللہ عن الجمعة من کان قبلنا	اگلی امتوں کو جمعہ سے خدا نے غافل کر دیا،
فکان للیہود یوم السبت وللنصاری	یہود شنبہ کو اور نصاری یکشنبہ کو جمعہ
یوم الاحد فجاء اللہ بنا فہدانا الیوم	سمجھ بیٹھے لیکن اللہ نے ہمیں جمعہ کا حصہ دار
الجمعة فجعل الجمعة والسبت والاحد	بنایا، اسی طرح وہ قیامت میں بھی ہمارے
وکذالک ہم تبع لنا یوم القیامة نحن	تابع ہوں گے، ہم دنیا کی آخری امت
الآخرون من اہل الدنیا والاولون	ہیں لیکن قیامت میں ہمارا حساب سب سے
یوم القیامة المقضی لہم (مسلم)	پہلے ہوگا۔

دوسری حدیث میں ہے:

ان ہذہ الامة اول من یدخل	یہ امت سب سے پہلے جنت میں جائیگی
الجنة من الامم وان محمداً	اور محمد رسول اللہ پہلے شخص ہوں گے جن کے لئے
اول من یفتح لہ باب الجنة،	باب جنت کھلے گا۔

حضرت ابن عباسؓ کے مولیٰ کریب کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ اور دوسرے اصحاب نے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس یہ سوال بھیجا کہ آنحضورؐ کس دن زیادہ روزہ رکھتے تھے؟ انھوں نے کہلایا کہ شنبہ و یکشنبہ کو زیادہ تر روزے رکھتے اور فرماتے کہ یہ یہود و نصاریٰ کی عید کے دن ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ روزہ رکھ کر ان کی مخالفت کروں۔ (انہما یوما عید للمشرکین فانا احب ان اخالفہم)

(احمد نسائی)

مسئلہ پر صحابہؓ کا اجماع

حضرت عمرؓ نے ذمیوں پر شرط لگا دی تھی کہ وہ اپنی عیدوں اور تہواروں کا مظاہرہ نہیں کریں گے اور تمام صحابہؓ بھی اس فیصلے میں ان کے ساتھ تھے اس سے معلوم ہوا کہ جب اس میں اتنی شدت ہے کہ خود غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں اس کے اظہار کی اجازت نہیں تو خود مسلمانوں کا اس میں شریک ہونا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے، ابو شیخ اصبہانی کی روایت عطار بن یسار یا ابن دینار سے ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا "نہ عجمی بولی بولو نہ عید کے دن ان کے گرجوں میں جاؤ" بیہقی نے یہی روایت کی ہے جس میں اس کی علت یہ بتائی گئی ہے کہ "ان پر غضب نازل ہوتا ہے" سفیان ثوریؒ حضرت ابن عمروؓ سے روایت کرتے ہیں کہ،

من بنی ببلاد الاعاجم وصنع نیروزھم	جو عجم میں رہا سہا، نوروز اور دوسری عیدیں مناتا
ومھرجانھم وتشبہ بھم حتی یموت	اور ان کی نقل کرتا رہا حتی کہ مر گیا تو وہ قیامت
وھو کذلک حشر معھم یوم القیامۃ	میں انہی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

حضرت عمرؓ سے دوسری روایت ہے کہ،

اجتنبوا اعداء اللہ فی عیدھم"	خدا کے دشمنوں کی عید سے بچو۔

محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے نیروز کے موقع پر اپنی زبان سے یہ لفظ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا۔

شیخ الاسلام نے امام ابوالحسن آمدی معروف بہ ابن البغدادی کی کتاب "عمدۃ الحاضر وکفایۃ المسافر" سے ایک اقتباس نقل کیا ہے:۔

"امام احمدؒ کے ہاں ان تقریبات میں شرکت ممنوع ہے لیکن عید کے دن ان کے بازاروں میں خرید و فروخت کے لئے جایا جا سکتا ہے (فاما مايباع فی الاسواق من الماکل فلا وان قصد الی توفير ذالك وتحسينه لاجلهم) اسی سے معلوم ہوا کہ مسلمان دکانداران عیدوں میں غیر مسلموں کے لئے اپنی دکان لگا سکتا ہے، خلال اپنی جامع میں لکھتے ہیں کہ مہنا نے اپنے استاد امام احمد سے پوچھا کہ مسلمان غیر مسلم تقریبات میں گائے، بکریاں، غلام، جو، گیہوں وغیرہ کی تجارت کے لئے جاتے ہیں تو کیا یہ جائز ہے؟ امام نے فرمایا کہ اگر عبادتی جگہوں پر نہیں جاتے تو جائز ہے۔

غیر اسلامی زبانوں کا مسئلہ[1]

ابو محمد کرمانی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے عجمی مہینوں کے نام کے متعلق پوچھا تو انھوں نے اسے سخت ناپسند کیا۔

---

[1] عربی زبان وہ واحد زبان ہے جسے احادیث میں اسلامی زبان کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے، اس کے علاوہ فارسی، اور اردو دنیا کی وہ زبانیں ہیں جن کا خاص تعلق مسلمانوں سے ہے اور مسلمان انھیں دوسری اسلامی زبانیں سمجھتے ہیں لیکن بہرحال وہ عربی کے تقدس کو نہیں پہنچ سکتیں، زبان کے مسئلہ میں ہمارے اسلاف نے کبھی تنگ نظری سے کام نہیں لیا، عہد نبوی میں کئی صحابیوں کے نام ملتے ہیں جو عبرانی، سریانی، قبطی، رومی، حبشی زبانیں جانتے تھے، لیکن ایک ہے زبان کو خدمتِ دین اور اشاعتِ حق کے لئے سیکھنا اور استعمال کرنا اور ایک ہے ان سے مرعوب ہو کر اور زمانے کا چلن دیکھ کر انھیں اپنانا، اسی دوسری صورت کو فقہا اور علمائے اسلام نے غلط بتایا ہے، جو کسی تعصب کی دلیل نہیں بلکہ قومی خودی کی حفاظت کے لئے ضروری ہے، یورپین زبانوں اور خصوصاً انگریزی سے تعلق خاطر رکھنے والوں نے (باقی صفحہ ۹۰ پر)

حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے کہ وہ آذرماہ اور دی ماہ کہنا مکروہ سمجھتے تھے،
ابو محمد نے ان سے پوچھا کہ اگر کسی کا نام ہی ایسا ہو تو کیا وہ لیا جا سکتا ہے؟ آپ نے اسے بھی

(باقی صہ ۹۹ کا) جس طرح اسلامی تہذیب سے قطع تعلق کیا وہ اب تک مشاہدہ میں آتی رہتی ہے۔

اب یہ طے شدہ ہے کہ زبان وادب کسی قوم کی روح کا آئینہ ہوتے ہیں اور اس کی تہذیب و تمدن کا ایک لازمی عنصر، اسی لئے کسی غیر زبان کو اپنانے کا مطلب دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں کہ یا انسان اخلاص کے ساتھ صرف زبان کی حد تک اس سے اعلائے حق کا کام لینا چاہتا ہے یا پھر ذہنی اور نفسیاتی طور پر اس زبان سے اور اسے بولنے والی قوم سے مرعوب ہے، فقہائے احناف نے زبان کے مسئلے میں اتنے توسع سے کام لیا ہے کہ اگر کوئی عربی کوشش کے باوجود نہیں بول سکتا تو وہ اپنی عجمی زبان ہی میں نماز پڑھ سکتا ہے، ورنہ جس حد تک انسان عربی استعمال کر سکتا ہے اسے کرنا چاہیئے۔

آگے ائمہ اور علماء کے جو بیانات غیر عربی زبانوں کے سلسلے میں آئیں گے ان سے پہلے یہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ ان لوگوں نے یہ رائیں اس خیال سے ظاہر کی تھیں کہ اسلام عرب قوم اور عربی زبان کے واسطے سے پھیل رہا تھا اگر شروع میں عربی ثقافت کو یہ اہمیت نہ دی جاتی اور عربی زبان پر یہ زور نہ دیا جاتا تو اسلامی ثقافت کو نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ تھا۔ صدر اول کے مسلمانوں کی فطری طور پر یہ خواہش تھی کہ اسلام جس زبان کے ذریعہ ہم تک آیا ہے ہم اسکی حفاظت کا سامان کریں، اگر اس وقت وہ اس پر زور نہ دیتے تو نہ عربی زبان محفوظ رہتی اور نہ اس میں موجود اسلامی تعلیمات کا ذخیرہ۔ اسکے علاوہ ان لوگوں کو منافقوں اور سازشی لوگوں کا سامنا تھا جو دوسری زبانوں میں ادائے مطلب اور اخفائے حال کرتے تھے اسلئے بھی دوسری زبانوں کے معاملہ میں سخت رویہ اختیار کیا گیا۔

بعد میں جب یہ صورت نہ رہی اور دوسری زبانوں میں بھی اسلامیات کا ذخیرہ ہو گیا تو دوسری زبانوں کو بھی رعاتیں ملیں حتیٰ کہ امام اعظمؒ نے عجمی زبان میں دعا اور تحریمہ تک کی اجازت دیدی (مرتب)

مکروہ سمجھا انھوں نے کہا کہ میں نے اسحاقؒ سے پوچھا تو انھوں نے کہا اگر ان میں کوئی مکروہ (یعنی خلافِ اسلام) نام نہ ہو تو گنجائش ہے، ابن المبارکؒ "یزداں" کی حلف کو مکروہ سمجھتے اور فرماتے تھے کہ مجھے ڈر رہتا ہے کہ ان ناموں میں غلط مشرکانہ تصورات نہ ہوں

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ عجمی ناموں کی کراہت کی دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ ہو سکتا ہے کہ وہ مشرکانہ ہوں اسی ڈر سے عجمی زبانوں کے گنڈے تعویذ مکروہ ہیں کراہت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے آدمی دوسری زبانیں بولنے کا عادی بن جاتا ہے اور عربی کی اہمیت اس کے دل سے نکل جاتی ہے، حالانکہ عربی اسلام کا شعار اور مسلمانوں کا وقار ہے، اور زبان یوں بھی کسی قوم کا سب سے بڑا امتیاز اور اعزاز ہوتی ہے۔

فقہا کے ہاں نماز کو غیر عربی میں پڑھنے میں اختلاف ہے، لیکن اس کے تین درجے کئے جا سکتے ہیں ایک قرآن، دوسرے اذکار واجبہ جیسے تحریمہ اور سلام و تشہد ان کے ہاں جو انھیں واجب کہتے ہیں، پھر تیسرے درجے میں دعا، تسبیح، تکبیر وغیرہ۔

قرآن کا حکم یہ ہے کہ اسے غیر عربی میں نہیں پڑھا جا سکتا، خواہ قدرت ہو یا نہ ہو اس سے کوئی بحث نہیں، اذکار واجبہ میں بھی امام احمدؒ امام مالکؒ اور اسحٰق کی رائے ہے کہ ان کا ترجمہ بھی نہیں کیا جائیگا، امام احمد کا ایک قول یہ ہے کہ جائز ہے امام ابو یوسفؒ امام محمدؒ اور امام شافعیؒ بھی یہی کہتے ہیں۔ اور دوسرے اذکار میں بھی علماء کی تصریحات یہی ہیں کہ ترجمہ نہ ہوں گی بلکہ اس سے نماز باطل ہو جائیگی، یہی امام مالک، اسحاق اور بعض اصحاب شافعی کا قول ہے لیکن امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ مکروہ ہے لیکن نماز باطل نہ ہو گی، اور اصحاب امام احمد معذور کے لئے ترجمہ کی اجازت دیتے ہیں، اور دوسرے احکام میں عجمی زبان سے جو فرق پیدا ہوتا ہے ان کی تفصیلات فقہ میں

مذکور ہیں ـــــــ اس کے علاوہ دوسرے فنون میں غیر اسلامی زبانوں کا استعمال اگر لاعلمی کے ساتھ ہو تو ناروا ہے اور زبان سے واقفیت کی حالت میں بھی امام احمدؒ اسے مکروہ سمجھتے ہیں، امام احمدؒ سے نماز میں دعا کے لئے ان زبانوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انھیں بری زبان (لسان سوء) قرار دیا، امام مالک فرماتے ہیں عجمی زبان میں نہ تحریمہ باندھے، نہ دعا مانگے، نہ قسم کھائے۔

سلفی نے امام شافعیؒ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ اللہ نے کاروباری لوگوں کو تاجر کہا عرب اور رسول اللہ بھی اس قوم کے لئے "تجار" کا لفظ استعمال کرتے تھے، لیکن "سماسرہ" عجمی لفظ ہے اس لئے ہم عربی جاننے والوں کی زبان سے یہ لفظ سننا نہیں چاہتے، کیونکہ اللہ کی محبوب زبان عربی ہے۔

ابوبکر ابن ابی شیبہ نے مصنف میں حضرت عمرؓ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ: ما تعلم الرجل الفارسیۃ الا خب، ولا خب رجل الا نقصت مروتہ۔ (کوئی فارسی پڑھتا ہے تو وہ حیلہ باز ہو جاتا ہے اور جو ایسا ہو اس کی شرافت میں نقص آیا[1])۔ اس میں سعد بن ابی وقاصؓ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے کسی کو فارسی بولتے دیکھ کر فرمایا، "مابال المجوسیۃ بعد الحنیفیۃ؟ (دینِ خالص کے بعد یہ مجوسیت کہاں سے آگئی؟) سلفی ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: من یحسن ان یتکلم

---

[1] یہ اس وقت کہا گیا تھا جب ایران تازہ تازہ فتح ہوا تھا اور ملکی مصالح اسکے مقتضی تھے کہ عربی کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کیا جائے تا آنکہ خود مسلمان فارسی زبان سمجھنے لگیں، چنانچہ اموی دور میں بہت سے ایرانی دفاتر میں بھی کام کرنے لگے۔ اور پھر فارسی آگے چل کر عربی کے بعد دوسرے نمبر کی اسلامی زبان ہو گئی (مرتب)

بالعربیۃ فلا یتکلم بالعجمیۃ فانہ یورث النفاق (جو اچھی طرح عربی بول سکتا ہے وہ عجمی نہ بولے کہ یہ نفاق پیدا کرتی ہے) انہی کی دوسری روایت ابن عمر کے واسطے سے حضرت عمرؓ سے اسی طرح ہے، اکا دکا عجمی لفظ یا کبھی کسی ضرورت پر غیر عربی کا استعمال بالکل جائز ہے، اسلاف سے اس کی روایت ملتی ہے، ابو خلدہ کہتے ہیں، ابو العالیہ نے مجھ سے فارسی میں گفتگو کی، منذر الثوری کہتے ہیں کسی نے محمد بن الحنفیہ سے "خبز" کے بارے میں پوچھا تو آپ نے ایک جاریہ کو خرید کر لانے کا حکم دیا اور دکھایا، مخاطب کی رعایت سے تو خود آنحضورؐ[1] سے غیر عربی زبانوں میں کلمات ثابت ہیں، ام خالد بنت خالد ابن سعید بن العاص حبشہ کی ایک کم عمر مہاجرہ تھیں واپسی پر انھیں حضورؐ نے ایک قمیص پہنائی اور فرمایا "یا ام خالد ھذا سنا" (ام خالد! یہ سنا ہے) سنا، حبشی میں حسن کے لئے آتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ کسی کو درد شکم میں مبتلا دیکھ کر حضورؐ نے فارسی میں دریافت فرمایا "اشکم بدرد" کیا پیٹ میں درد ہے؟ ان استثنائی حالتوں کے علاوہ کسی غیر زبان کا مادری زبان بنا لینا انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی طور پر ہر حالت میں مکروہ ہے، اس لئے کہ یہ کھلا ہوا تشبہ اور صراحتہً ذہنی غلامی اور مرعوبیت ہے جس کا ایک منٹ کے لئے بھی اسلام روادار نہیں ہو سکتا، اسی لئے اگلے مسلمان جب مصر و شام آئے تو انھیں رومی زبان سے واسطہ پڑا، عراق و خراسان میں فارسی سے سابقہ ہوا، افریقہ میں بربری سامنے آئی لیکن ان کی ذہن آفریں اور تاریخ ساز ہمتوں نے

---

[1] ابن جریر کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ایک بار حضرت ابو ہریرہؓ کو پیٹ کے بل لیٹے دیکھا تو فرمایا (اشکم درد؟) کیا پیٹ میں درد ہے؟ انھوں نے کہا ہاں! آپؐ نے فرمایا کہ تو کھڑے ہو کر کچھ نماز پڑھو کہ نماز شفا ہے (تفسیر ابن کثیر ۱/۸۶) (مرتب)

عربی کو اس طرح رائج کیا کہ دوسری زبانوں کا پتہ بھی نہ چلا، اس کے بعد طاؤس ورباب کے دور میں انھوں نے زبان کے معاملے میں غفلت برتنا شروع کی جس کے نتیجہ میں مقامی زبانیں سر اٹھانے لگیں شیخ فرماتے ہیں:

واعلم ان اعتیاد اللغۃ یوثر فی العقل	عربی زبان عقل، اخلاق، اور دین پر کھلے
والخلق والدین تاثیرا قویا بینا	طور پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور صحابہ و
ویؤثر ایضا فی مشابھۃ صدر ھذہ	تابعین کی مشابہت پر بھی ابھار سکتی ہے
الامۃ من الصحابۃ والتابعین ومشابھتہم	جو عقل وخلق اور دین میں ترقی کا باعث ہوگی
تزید العقل والدین والخلق وایضا	اس لئے یہ زبان دین کا جزء ہے، اور اس کا
فان نفس اللغۃ العربیۃ من الدین	جاننا فرض اور واجب، اس لئے کہ کتاب و
ومعرفتھا فرض واجب فان فھم	سنت کا فہم فرض ہے جو عربی جانے بغیر
الکتاب والسنۃ فرض ولا یفھم الا بفھم	نہیں ادا ہوتا، اور جس سے کوئی واجب
اللغۃ العربیۃ وما لا یتم الواجب	پورا ہوتا ہو تو وہ چیز بھی واجب ہو جاتی
الا بہ فھو واجب۔	ہے۔

ابو بکر ابن ابی شیبہ نے مصنف میں لکھا کہ حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعری کو لکھا:

اما بعد فتفقھوا فی السنۃ وتفقھوا	سنت کا علم حاصل کرو اور عربی کا علم بھی اور
فی العربیۃ واعربوا القرآن فانہ عربی	قرآن کو صحت کے ساتھ پڑھو کہ وہ بھی عربی
	میں ہے۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے تعلموا العربیۃ فانھا من دینکم وتعلموا الفرائض فانھا من دینکم، (عربی اور علم الفرائض سیکھو یہ تمہارے دین کا جز ہیں)

غیر اسلامی عیدوں پر تفصیلی نظر

غیر اسلامی عیدوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ غیر اسلامی تہذیبوں کا سب سے بڑا رمز اور ان کی سب سے بڑی علامت (SYMBOL) ہوتی ہیں اس لئے ان میں شرکت کے معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ مسلمان سب سے بڑے شعارِ کفر اور علامتِ شرک کو اپنا لے بلکہ تمثیلی طور پر یوں کہئے کہ یہ تیوہار بھی غیر اسلامی شریعت و شعائر ہیں جنھیں اسلام نے منسوخ کر دیا ہے کہ (ایں ہم بچہ شتر است) ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ ان عیدوں میں شرکت کم از کم بدعت کے ارتکاب سے قریب تو ہی ہے، اس لئے ہم مانتے ہیں کہ مسلمان انکے خالص عبادتی پروگرام میں شریک نہیں ہوتا لیکن دوسرے کھیل تماشے اور آرائش و نمائش تو بہر حال عید ہی کا حصہ ہیں، اس طرح ان میں جانا بھی شرکت ہی کے ہم معنی ہے ان تیوہاروں پر ایک اور طرح سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہم اگر شرکت کی کوئی صورت جائز کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دھیرے دھیرے عام شرکت کی اجازت بھی دیتے ہیں اس لئے کہ رفتہ رفتہ عوام اس میں دلچسپی لینے لگیں گے اور پھر وہ کسی کے روکے نہیں رکیں گے، چنانچہ صوم نصاریٰ کے خاتمہ پر بعض علاقوں کے مسلمان بھی ان کے ساتھ خوشی مناتے اور عید البقر عید سے بڑھ کر اہتمام کرتے تھے، خود میں نے دمشق وغیرہ میں دیکھا ہے کہ لوگ کس طرح حدود کو توڑتے ہیں (حالانکہ یہ وہ شہر ہے جہاں علم و ایمان کی کمی نہیں۔

سات ہفتوں کے روزے کے آخر میں نصاریٰ پنجشنبہ مبارک جس کو غالباً "MAUNDY" کہا جاتا ہے

لہ مگر اسکی روایت یہ ہے کہ اسی میں حضرت مسیحؑ نے شاگردوں کے پاؤں دھوئے تھے اور یہ روزہ ۴۰ دن کا ہوتا ہے جسکے آخر میں ایسٹر آتا ہے۔

مناتے ہیں، جو شمسی سال کے کسی حصہ میں بھی پڑ سکتا ہے اس لئے کہ اس کی کوئی حد متعین نہیں، جیسے وہ جمعرات جو نیسان (اپریل) کے شروع میں منائی جاتی ہے، بلکہ وہ ۴۳ دنوں میں بھی پوری ہو جاتی ہے، جس کی پہلی شباط (فروری) کی دوسری سے پہلے اور آذار (مارچ) کی دوسری کے بعد نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس میں شمسی اور قمری دونوں تاریخوں کا لحاظ رکھتے ہیں، لیکن یہ سب تیوہار بدعت ہیں، اس لئے کہ شریعت عیسوی میں تمام اوقات چاند ہی سے متعین کئے گئے تھے، اسی طرح جمعہ صلیب کے مقابل "جمعہ صلبوت" مناتے ہیں، اسی سے متصل دوسرے دن شنبہ کی رات مناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس رات میں مسیح قبر میں تھے، اسے وہ "لیلۃ النور" اور "سبت النور" بھی کہتے ہیں، اس رات ایک خرقہ بناتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ وہ نور کنیسۃ القمامہ (بیت المقدس) میں نازل ہوتا ہے، جسے وہ اپنے ہاں لاتے ہیں، پھر یکشنبہ کو عید کبیر (EASTER SUNDAY) ہوتی ہے، جس میں سمجھا جاتا ہے کہ مسیحؑ جی اٹھے تھے، پھر اس کے بعد والے اتوار کو یکشنبہ جدید (NEW SUNDAY) کے طور پر مناتے ہیں، چربی اور ذی روح کے گوشت سے پرہیز کرتے اور پھر انڈا، گوشت اور دودھ سے افطار کرتے ہیں، اس طرح کی اور دوسری بدعتوں کا وہ ارتکاب کرتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہودی اگرچہ کسی نئی شریعت اور نئے رسول کے قائل نہیں اور نہ نسخ مانتے ہیں، لیکن عیسائی اس کے قائل ہیں، اور اپنے پوپ، پادریوں کو شریعت میں تبدیلی کی اجازت دیتے ہیں۔

یہ تفصیل اس لئے ضروری تھی کہ مسلمان بھی ان کے زیر اثر آچکے ہیں اور وہ بھی اس موقع پر اپنے قبرستانوں میں چراغاں کرتے اور بخور جلاتے اور سمجھتے ہیں کہ اس سے

برکت ہوگی اور مصیبت دور ہوگی، گلے میں تعویذیں چھوٹے ناقوس کی طرح پہنتے ہیں، اور دروازوں پر صلیب کا نشان بھی بنا لیتے ہیں، اور تو اور بعض لوگ زبردستی چندے سے یہ تقریبات مناتے ہیں اس طرح وہ مال مسلم کے غصب اور اقامتِ باطل دونوں جرموں کے مرتکب ہوجاتے ہیں، بعض لوگ اُن مواقع پر خاص رنگوں سے گھروں کو رنگتے ہیں جو کسی عظیم منکر سے کم نہیں ہوتا۔

اسی طرح نصاریٰ اپنے روزے کی آخری جمعرات اور جمعہ کو بڑی دھوم سے مناتے ہیں، اور روزے کے پہلے اتوار کو "عید شعانین" مناتے ہیں، جس میں برگ زیتون نکالے جاتے ہیں وہ اس کی یادگار ہوتے ہیں کہ مسیح جب بیت المقدس آئے تو یہودیوں نے انھیں ستانے کے لئے اوباشوں کو پیچھے لگا دیا تھا، انھوں نے جب لاٹھیاں اٹھائیں تو ان میں پتے نکل آئے، جس پر انھوں نے توبہ کی اور اپنے ارادے سے باز رہے۔

جمعرات کو وہ عید المائدہ (HOLY COMMUNION, OR, LAST SUPPER) اور اتوار کو عید الفصح (EASTER) کے طور پر مناتے اور رنگے ہوئے انڈے تقسیم ..... کرتے ہیں، چھوٹی چیزوں میں غفلت کا انجام یہ ہوا کہ بعض لوگ کفر صریح تک بھی پہنچ گئے جیسے صلیب سے تبرک حاصل کرنا، اوبپتسمہ دینا، یا کسی کا کہنا کہ معبود تو ایک ہی ہے لیکن اس تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں، یہ سب باتیں بلا اختلاف کفر باللہ اور انکارِ اسلام ہیں، "سدِ ذرائع" شریعت کا متفق علیہ جزئیہ ہے، میں نے اپنی کتاب "اقامۃ الدلیل علی بطلان التحلیل" میں اس کے ۳۰ دلائل لکھے ہیں، اور عیدوں کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ کس طرح عقیدہ وعمل پر اثر انداز ہوتی ہیں اسی لئے

ہر مذہب و تہذیب میں ان کا ایک خاص مقام رہا ہے:

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ (۲۲:۶۷)
ہم نے ہر امت کے لئے اجتماعی دن بنائے جنھیں لوگ جمع ہو کر مناتے ہیں۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ۔ (۲۲:۳۴)
ہم نے ہر امت کے لئے ایام حج بنائے تاکہ اپنی رزق پر خدا کا نام لیں۔

حجۃ الوداع میں یوم نحر میں تکمیل دین کا جب اعلان ہوا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اب مسلمانوں کو اپنی شریعت کو قلب و روح کی غذا، اور ہر درد و الم کی دوا سمجھنا چاہیئے ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "وان کل ادب یحب ان یوتی مادبتہ وان مادبۃ اللہ ھی القرآن" (ہر دعوت دینے والا چاہتا ہے کہ لوگ اسکی دعوت میں آئیں خدا کی دعوت قرآن ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ اسے پڑھیں) جسم کی خصوصیت یہ ہے کہ جب ایک کھانے سے سیر ہو گیا تو دوسرے کی طرف رغبت نہیں کرتا اور زبردستی کھاتا ہے تو تخمہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اسی طرح جو غیر اسلامی تہذیبوں کے اثرات سے دل و دماغ بسالیتا ہے وہ اسلام کی طرف کیونکر مائل ہو سکتا ہے:

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیب است سالک را
خجل ہستم زکفر خود کہ دار د بوئے ایماں ہم! (شبلیؒ)

آپ دیکھیں گے کہ جو "یاران طریقت" اصلاح قلب کے لئے وجد و سماع کا سہارا لیتے ہیں اتنے ہی وہ قرآن سے دور ہو جاتے بلکہ کبھی کبھی اسے ناپسند بھی کرنے لگتے ہیں

اور جو لوگ درگاہوں اور آستانوں پر سفر کر کے حاضری دیتے رہتے ہیں، ان کے دل سے حج بیت اللہ کا ذوق و شوق نکل جاتا ہے، جو روم و ایران اور دنیا کے فلسفوں میں حکمت و معرفت تلاش کرتا رہتا ہے، اس کے ذہن و دماغ میں "حکمت یونانیاں" کی پرچھائیاں تو اپنا سایہ ڈال دیتی ہیں، لیکن "حکمت ایمانیاں" کی تجلیاں نکل جاتی ہیں، اور جو قصے کہانی اور افسانہ، تاریخ اور ڈرامہ کا دلدادہ ہو جاتا ہے تو انبیاء و مرسلین کی حکایات اور سیرتوں سے اکتانے لگتا ہے، اسی لئے حدیث نبوی میں ہے کہ

ما ابتدع قوم بدعة الا نزع الله عنهم من السنة مثلها (احمد)

کوئی قوم جب بدعت کا ارتکاب کرتی ہے تو اس کے بقدر سنت سے محروم کر دی جاتی ہے

شرکت و صحبت، اور مشابہت و معاشرت کا اثر جس طرح انسانوں پر ہوتا ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، حدیث میں آتا ہے کہ انسانی طبیعتیں چور ہوتی ہیں، یعنی عادتیں فوراً اپنا لیتی ہیں "الطبائع سراقة"، انسان تو انسان آدمی تو جانوروں تک سے عادات و اخلاق سیکھ لیتا ہے اونٹ کے ساتھ رہنے والے اکثر فخر و غرور میں مبتلا پائے جاتے ہیں، بکری چرانے والے عموماً رحم دل ہوتے ہیں اسی طرح اونٹ اور خچر کے سواروں میں ان کے اخلاق پیدا ہو جاتے ہیں، کتوں کو پالنے والے بھی بعض عادتوں میں کسی نہ کسی طرح ان کے مشابہ ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جو یہودی اور عیسائی اسلامی ممالک میں رہتے ہیں ان کا کفر ہلکا ہو جاتا ہے، اور جو مسلمان ان سے میل جول رکھتے ہیں، ان کے ایمان میں خلل اور فتور آ جاتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان دشمنانِ خدا کی دوستی دل میں گھر کر لیتی ہے، حالانکہ ان کے لئے صاف حکم ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۵: ۵۱﴾	مومنو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ وہ بعض کے بعض دوست ہو سکتے ہیں اور تم میں سے جو ان سے دوستی رکھے گا وہ انھیں میں سے ہوگا اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (آیات ۵: ۵۸، ۷۷: ۲۲ بھی اسی مفہوم میں ہیں)

شرکت و مشابہت کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک میں انسان غیر شعوری طور پر یہ حرکت کرتا ہے، دوسری میں جان بوجھ کر کرتا ہے جو کفر ہے، ایک صورت یہ ہے کہ اسے خبر ہی نہیں کہ یہ دوسروں کا عمل ہے، اس صورت میں گناہ تو نہ ہوگا لیکن علم کے بعد توبہ ضروری ہے پھر بعض رسوم ایسے بھی ہوتے ہیں جو عیسائیوں کے مذہب سے ماخوذ نہیں ہوتے لیکن انھیں عیسائی مناتے ہیں تو ان سے مسلمانوں کو بچنا ہی ہوگا کیونکہ ان کی مخالفت ہی مطلوب شریعت ہے۔

غیر اسلامی تقریبات میں شرکت و مساہمت صرف عملی شرکت ہی پر موقوف نہیں بلکہ کسی طرح بھی ان سے مشابہت، شرکت ہے، جیسے مخصوص خوشبوؤں کی خرید و فروخت، عیسائی تیوہاروں میں انڈے کی تجارت، گایوں کو سرخ نقطے سے رنگنا، درختوں کو ٹیکہ لگانا، زیتون سے نہانا، صنعت و تجارت اور علمی مقامات میں تعطیل منانا بھی شرکت ہی ہے، جاڑوں میں "کانون الاول" (دسمبر) کی ۲۴ کو عیسیٰؑ کے یوم ولادت کے طور پر منانا اور روشنی کرنا "عید الغطاس" (بپتسمہ) منانا، یہودیوں کے تیوہار اور نیروز و مہرجان سب کفر کے مختلف مدارج ہیں۔ ان مواقع پر مسلمان

آپس میں بھی کوئی عمل ہدیہ اور خرید فروخت وغیرہ ایسا نہیں کریں گے جن میں کفار کی مشابہت اوران کی اعانت ہوتی ہو، کفار سے عید کے موقع پر خرید تو سکتے ہیں لیکن کوئی مسلمان بازارِ کفر میں دکان لگانا چاہے تو یہ جائز نہیں جیسے اس انگور کو بیچنا جائز نہیں، جسکے متعلق معلوم ہے کہ وہ اسے شراب بنائیں گے یا وہ اسلحہ جن سے وہ مسلمانوں سے لڑیں گے۔

عبدالملک بن حبیب اسے مکروہ اور امام مالکؒ حرام کہتے ہیں، انھوں نے واضحہ میں کہا ہے کہ امام مالک کنیسہ کا ذبیحہ مکروہ سمجھتے ہیں۔

ابن القاسم غیر اسلامی تقریبات کے موقع پر ان کے ساتھ سوار ہونے کو بھی خدا کی لعنت وغضب سے بچنے کے لئے مکروہ کہتے ہیں۔

بیع واجارہ کی ممانعت

امام احمد کسی مسلمان معمار کو اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ غیر مسلموں کی عبادت گاہ بنائے، فرمایا (لاتبن لهم، ولاتعنهم على ماهم فيه) امامؒ نے غیر مسلم کو کرایہ پر اپنے مکان میں رکھنا بھی مکروہ سمجھا ہے، اسحاق بن منصور کہتے ہیں کہ اوزاعیؒ نصاریٰ کے انگوروں کی حفاظت کی نوکری ناجائز کہتے ہیں، لیکن امام ابوحنیفہؒ کافر کو کرایہ پر مکان دینا جائز سمجھتے ہیں اس لئے کہ یہ ضروری نہیں کہ وہ کفر وشرک کے اعمال لازمًا اسی گھر میں کرے، گویا گھر ان کے ہاں مختلف کاموں کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے اس لئے بیع واجارہ میں کوئی قباحت نہیں ہاں مشرک سے ہتھیار اس لئے فروخت نہیں کریں گے، کہ ہتھیار جنگ ہی کے لئے بنائے گئے ہیں، ذمی سے

خراجی یا عشری زمین لینا بھی اسی لئے نامناسب کہا گیا ہے کہ وہ اس طرح عشر و خراج سے بچنا چاہتا ہے، ذمی کا ارضِ اسلام پر اسے ٹھیک کر کے قبضہ کرنا بھی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک غلط ہے امام مالک سے دونوں روایتیں ہیں لیکن احیائے موات کے بعد ذمی پر امام احمد کے ہاں کوئی تاوان نہیں، البتہ اہل مدینہ کہتے ہیں کہ ذمی کو عشری زمین خریدنے نہیں دی جائے گی، اور اہل بصرہ اس پر عشر کو دگنا کر دینے کی تجویز رکھتے ہیں، عنبری قاضیٔ بصرہ کہتے ہیں کہ ذمی کی ہر زمین پر عشر ہوگا میمونی کی روایت میں امام احمد بھی حضرت عمرؓ کی روایت کی وجہ سے عشر کو دگنا کر دینے کے قائل ہیں، لیکن اس صورت میں ہے، جب وہ کھیتی اور تجارت دونوں کرتے ہوں عشر کو دگنا کرنے کے حق میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حسن بصریؒ اور امام ابو یوسفؒ ہیں اور بعض اس کے قائل نہیں ان میں بعض حنابلہ، ثوریؒ، امام محمدؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ ہیں، جو لوگ دونا کرنے کے قائل ہیں ان کا قیاس یہ ہے کہ مستامن اگر دارالاسلام میں کھیتی کرتا ہے تو اس سے دونا لیا جاتا ہے، اسی طرح اس کی تجارت پر بھی دونا ہی لیا جاتا ہے، ان سب باتوں سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کی زمینوں پر غیر مسلموں کا غلبہ نہ ہو اسی لئے امام احمدؒ ذمی کے لئے حق شفعہ کے قائل نہیں ہیں اور اسے ان حقوق میں سمجھتے ہیں جو صرف مسلمانوں سے متعلق ہیں، جیسے دعوت قبول کرنا مریض کی عیادت کرنا بیع اور خطبہ میں زیادتی کرنا، امام شافعی کتاب الام کے باب جزیہ میں لکھتے ہیں کہ کلیسا کے لئے ذمی کی کسی طرح کی وصیت باطل ہے انھوں نے لکھا ہے کہ کلیسا کی تعمیر میں مسلمان معمار کی کسی طرح کی شرکت مناسب نہیں، امام احمد بھی اسی کے قائل ہیں اور ان کے عبادتی کاموں میں کسی نوع کی شرکت ناپسند کرتے ہیں

وہ تعمیر کلیسا کی اجرت کو اسی طرح حرام کہتے ہیں، جیسے انجیل و توریت کی کتابت کی اجرت "ائمہ ثلاثہ" اور صاحبینؒ کے ہاں خمر و خنزیر کے ڈھونے کی اجرت بھی مسلمان کیلئے جائز نہیں، اس لئے کہ آنحضورؐ نے ان سے متعلق ہر معاملہ پر لعنت کی ہے، زنا، گانے بجانے اور دوسرے حرام پیشوں کی کمائی کے متعلق یہ حکم ہے کہ ان سے خود فائدہ اٹھانا ناجائز ہے، لیکن انھیں ملت کے مصالح کے لئے استعمال کرنا چاہیئے (جس طرح بینک، بیمہ، کمرشیل انٹرسٹ کی آمدنیوں کو مسلمان لیکر دوسرے خیراتی کاموں میں بغیر نیتِ ثواب کے استعمال کرسکتے ہیں) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ شراب خریدنے کے بعد خریدار کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ بیع فسخ کرسکتا اور اپنی قیمت واپس لے سکتا ہے اس لئے کہ اصولاً یہ بیع باطل اور فاسد ہے، حضرت عمرؓ نے شراب کی ایک دکان جلوادی تھی، اور حضرت علیؓ نے ایک پوری بستی ہی کو جلوادیا تھا جس میں شراب کا کاروبار ہوتا تھا، ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ شراب کسی طرح اسلامی حکومت میں گوارا نہیں کی جاسکتی، اسی طرح امام احمد نے غیر اسلامی تیوہاروں کے سامان کی خرید و فروخت ناجائز بتائی ہے، اور اسے اعانت علی الکفر کہا ہے، یہ تو عبادتی سامان کے لئے عام حکم ہے، لیکن کھانے پینے اور تفریح کی چیزوں کے بارے میں بھی امام مالک کراہت تحریمی کے قائل ہیں اور امام احمد کا رجحان بھی اسی طرف ہے لیکن بعض لوگ اسے کراہت تنزیہی تک رکھتے ہیں۔

ذبیحہ، پرساد اور ہدیہ کا حکم

غیر مسلموں کے تیوہاروں کے ہدایا کے متعلق حضرت علیؓ کا عمل اوپر گزر چکا ہے کہ

آپ نے "نوروز" کا ہدیہ قبول کیا تھا، ابن ابی شیبہ نے مصنف میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی عورت نے پوچھا کہ ہماری مجوسی خادمائیں اپنی عید کے موقع پر ہمارے پاس تحفے بھیجتی ہیں، کیا ہم انھیں قبول کرسکتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ ذبیحہ تو نہیں البتہ پھل وغیرہ لئے جاسکتے ہیں، نیز ابوبرزہ سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے مجوسی پڑوسی مہرجان اور نوروز میں ہدیے بھیجتے تو وہ اپنے گھر والوں کو پھل اور مٹھائیوں کی اجازت دیتے اور بقیہ لوٹا دیتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کے ہدایا میں ان کی عید کا اثر نہیں پڑتا اور نہ ان کے قبول کرنے سے کفر کی اعانت لازم آتی ہے، لیکن اہل حرب اور اہل ذمہ کے ہدایا قبول کرنے کی بحث ایک مستقل مسئلہ ہے جو کافی تفصیل چاہتا ہے۔ اجمالاً کہا جاسکتا ہے کہ اہل کتاب کے ہدایا (ان کے مخصوص ذبیحوں کو چھوڑ کر) استعمال کئے جاسکتے ہیں لیکن مجوسی کا ذبیحہ حرام ہے۔

پھر اہل کتاب اگر مسیح وزہرہ اور حضرت مریمؑ وغیرہ کے لئے قربانی کرتے ہیں تو وہ ناجائز ہے۔ یہی امام احمد کا مذہب ہے اور حضرت عائشہ اور ابن عمرؓ سے ایسا ہی مروی ہے، میمونی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے پوچھا تو فرمایا کہ اہل کتاب کلیسا کے لئے ذبح کرتے ہیں اور عمداً خدا کا نام چھوڑ دیتے ہیں، اس لئے اس کا کھانا جائز نہیں لیکن امام احمد ہی کہتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداءؓ ان کے کھانے کو حلال سمجھ کر استعمال کرتے تھے۔

امام احمدؒ امام اوزاعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے میمونؒ سے نصاریٰ کے ذبیحۂ عید کے متعلق پوچھا تو فرمایا کہ مکروہ ہے، حنبل عطاءؒ سے روایت کرتے ہیں کہ

جس ذبیحہ پر حضرت مسیحؑ کا نام لیا گیا ہو وہ اس کے کھانے کو جائز سمجھتے تھے، خلال کہتے ہیں کہ امام احمد سے اس باب میں کراہت تحریمی ہی ثابت ہے حنبل کی روایت ہے کہ کلیسا اور عید کے موقع کے علاوہ عام ذبیحہ کھایا جاسکتا ہے اگرچہ اس پر انھوں نے بسم اللہ نہ پڑھی ہو، ایک جگہ امام احمد نے (وَلَا تَاكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ) سے مراد میتہ اور مردار لیا ہے۔

لیکن امام احمدؒ ہی کی دوسری روایت ہے کہ غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام نہیں مکروہ ہے، ان کے صاحبزادے عبداللہ کہتے ہیں، میں نے ان سے پوچھا کہ زہرہ کا ذبیحہ کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ مجھے پسند نہیں، میں نے کہا کیا، حرام ہے فرمایا: حرام نہیں کہتا لیکن مجھے بھاتا نہیں، ابوالحسن آمدیؒ کہتے ہیں کہ غیر اللہ میں، کلیسا، زہرہ، اور شمس و قمر کے لئے ذبیحے آجاتے ہیں، مدونہ میں ہے کہ اہل کتاب کا کلیسائی ذبیحہ یا عید کا ذبیحہ مکروہ ہے، حرام نہیں۔

عید کے ذبیحہ کا استعمال بعض صحابہؓ سے ثابت ہے، لیکن اس میں یہ تفصیل ہے کہ اس پر صراحۃً غیر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اس لئے کہ جمہور کے ہاں یہ حرام ہے اور یہی ائمہ ثلاثہؒ کا بھی مذہب ہے، اور یہی حضرت علیؓ حضرت ابوالدرداءؓ، ابوامامہؓ عرباض بن ساریہؓ، عبادہ بن صامتؓ اور اکثر فقہائے شام کا مسلک بھی ہے، ایک مشرب یہ بھی ہے کہ غیر اللہ کا نام لئے جانے کے باوجود ان کا ذبیحہ حرام نہیں، یہی عطا، مجاہد، مکحول، اوزاعی اور لیث رحمہم اللہ کا خیال ہے ابن منصور کہتے ہیں کہ امام احمد سے کہا گیا کہ سفیان ثوریؒ عمداً بسم اللہ چھوڑے ہوئے ذبیحہ کے کھانے کے قائل نہ تھے امام احمدؒ نے بھی ان کی تصویب کی، شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ اختلاف مذاہب کی

بنیاد دو آیتیں ہیں ایک میں کہا گیا:

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ۔ (۵:۵) کہ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔

اور دوسری آیت (۱۶: ۱۱۵) میں غیر اللہ کے لئے ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت حرام کر دیا گیا۔ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ غیر اللہ کا نام لیا جائے یا نیت کی جائے دونوں ہی حرام ہیں، مشرکین بھی کبھی اپنے دیوتاؤں کے نام پر قربانی کرتے ہیں کبھی نذرانہ کے طور پر اور کبھی دونوں طرح یہ سب صورتیں حرمت میں داخل ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ کتاب وسنت کے مزاج سے، یہی زیادہ قریب ہے، یہی امام احمدؒ کا مسلک ہے اگرچہ متاخرین حنابلہ اس روایت کا ذکر نہیں کرتے۔ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کا ذبیحہ انہی صورتوں میں حلال ہوگا، جن صورتوں میں مسلمانوں کا ذبیحہ حلال ہے اسکے علاوہ یہ شریعت کا قاعدہ ہے کہ جہاں حلت وحرمت کا ٹکراؤ ہوتا ہے، وہاں حرمت ہی کو احتیاطاً ترجیح دیتے ہیں، اور اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہے کہ کسی نبی کے مذہب میں مشرکانہ ذبیحے نہیں رہے، اس لئے اہل کتاب کے ذبیحہ کے ساتھ بھی اسی طرح معاملہ ہوگا۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ اہل کتاب اگر غیر اللہ کا نام لیتے ہیں تب تو ہم اسے حرام سمجھ سکتے ہیں لیکن اگر خالی نیت ہو زبان سے نہ کہا ہو تو کیسے حرمت کا پتہ چل سکے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب وہ اپنے متعین مقام پر ہی ذبح کریں یا کلیسا کے اندر قربانی ادا کریں تو حرمت ظاہر ہی ہے، یا خود ان سے پوچھ کر بھی معلوم کیا جا سکتا ہے، شیخؒ نے "ذبح علی النصب" کے بارے میں

لکھا ہے کہ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ "نصب" یعنی بتوں پر یا ان کی جگہ پر ذبح کیا جائے دوسرا مطلب یہ ہے کہ ان کے لئے ذبح کیا جائے، یہ دونوں صورتیں غیر اللہ ہی میں شامل ہیں اس لئے حرام ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ وادی بلدح میں آنحضرتؐ اور زید بن عمرو بن نفیل ہم سفر تھے، جب کھانے کا وقت آیا تو زید نے گوشت پیش کیا جسے آنحضرتؐ نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ میں بتوں کا چڑھاوا نہیں کھاتا (حالانکہ یہ نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے)۔

ایک روایت میں خود زید کے بارے میں آتا ہے کہ وہ قریش کا ذبیحہ نہیں کھاتا تھا، شیخ الاسلامؒ نے یہاں اپنے مخصوص انداز میں ایک نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض لوگ اسم غیر اللہ والے ذبیحہ کو حرام اور غیر اللہ کے لئے ذبیحہ کو مکروہ سمجھتے ہیں، لیکن درحقیقت دونوں ہی حرام ہیں، اگرچہ شدت میں دوسرا بڑھا ہوا ہے، اس کی صورت اس طرح ہے کہ جیسے ہم ایک ذبیحہ قربانی کے لئے کرتے ہیں تو یہ زیادہ باعث ثواب ہے، اور ایک صرف گوشت کے لئے کرتے ہیں، اسی طرح اہل کتاب ایک ذبح مسیح کا نام لیکر کرتے ہیں اور دوسرا خاص مسیح کے لئے کرتے ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ آخری صورت حرمت کے زیادہ قریب ہے، اس لئے کہ غیر اللہ کی عبادت غیر اللہ سے استعانت سے زیادہ بری ہے۔

ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ مسلمان بھی اگر زبان سے بسم اللہ کہہ لیتا ہے، لیکن دل میں کسی پیر فقیر، جن، شیطان وغیرہ کی نیت رکھتا ہے تو اس کا ذبیحہ بھی حرام ہے ابو داؤد میں حضرت ابن عباسؓ کی ہدایت ہے کہ "نهى عن معاقرة الاعراب"

(حضور نے بدوؤں کی قربانی سے منع کر دیا ہے) ابن شیبہؒ نے ابن عباس ہی سے "عقائر" کی تفسیر "غیر اللہ" نقل کی ہے، جارود کہتے ہیں کہ بنی رباح کے ابن وثیل نامی شاعر اور فرزدق کے باپ غالب نے نذر مانی تھی کہ ہم فلاں چشمہ پر اونٹ ذبح کریں گے جب انھوں نے ۱۰۰، ۱۰۰ اونٹ ذبح کئے تو لوگ گوشت کے لئے دوڑے لیکن حضرت علیؓ نے انھیں روک دیا کہ یہ غیر اللہ کی قربانی ہے، مجاہدؒ "نصب" کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ وہ کعبہ کے پاس ایک پتھر تھا جس پر اور جس کے لئے اہل جاہلیت قربانی کرتے اور اسے جب چاہتے بدل بھی دیتے تھے حضرت حسنؒ، قتادہؒ، اور حضرت ابن عباس کی تفسیر بھی یہی ہے۔

اسماعیل بن سعید کی امام احمد سے ایک روایت ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی کتابی کا جانور ذبح کرتا ہے تو وہ حلال ہے اس لئے کہ وہ شرعی طریقہ پر ذبح کریگا (لیکن کچھ علماء ابن تیمیہؒ کی اس رائے سے متفق نہیں کیونکہ کتابی کی نیت کا اعتبار ہوگا نہ کہ مسلمان کا جس کا جانور نہیں، بلکہ صرف عمل ذبح میں وہ شریک ہے)

کفار کے روزے اور تیوہار

کسی غیر اسلامی تیوہار اور ربرت کے موقع پر روزہ رکھنا مشابہت کے خوف سے مکروہ کہا گیا ہے، اس لئے اس کے آگے پیچھے ایک اور روزہ بھی ملالینے کا حکم ہے، یوم سبت کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا کہ سبت کا روزہ نہ رکھو اور اگر اس دن کسی کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہ ہو تو کسی درخت کی شاخ ہی چبالے۔ (سنن اربعہ) اثرمؒ نے امام احمدؒ سے بھی یہی روایت نقل کی ہے، لیکن دوسری

احادیث کے پیش نظر امام احمد نے اجازت بھی دی ہے، حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ سنیچر کو زیادہ روزے رکھتے تھے، حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے جمعہ سے پہلے یا بعد میں ایک دن ملا لینے کا حکم دیا تھا، اس لئے اثرمؒ، امام ابوداؤدؒ، زہریؒ، امام مالکؒ سب سبت کے روزے کے قائل ہیں، لیکن امام احمد کی صماءؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے یوم سبت میں مجھے کھانے کیلئے کہا تو میں نے معذرت کی کہ روزے سے ہوں اس پر آپؐ نے پوچھا کیا کل بھی روزہ سے تھیں؟ انھوں نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا "کھاؤ سبت کا روزہ کچھ اہم نہیں" اس لئے فقہا نے سبت کے آگے پیچھے بھی ایک اور روزہ ملا لینے کا حکم دیا ہے، ابن عقیل نے یہودیوں کے یوم تعطیل سے مشابہت کیوجہ کو اس حکم کی علت کہا ہے، امام احمد اور امام نسائی کی روایت میں ہے کہ حضورؐ فرماتے تھے کہ اہل کتاب کی عید کے دن (شنبہ، یکشنبہ) کو میں روزے ان کی مخالفت کے خیال سے رکھتا ہوں اور حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ اگر ایک مہینہ میں شنبہ، یکشنبہ، دوشنبہ کو روزے رکھتے تو دوسرے میں سہ شنبہ، چہارشنبہ، پنجشنبہ کو روزے رکھتے تھے، (ترمذی) یہ دونوں حدیثیں ان لوگوں کے خلاف نہیں ہیں جو "افراد سبت" کو مکروہ سمجھتے ہیں[1]۔

یہاں امام ابن تیمیہؒ نے ایک اور قاعدۂ شرعی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ روزے اور تیوہار اکثر اہل کتاب کی ایجاد اور بدعت ہیں اور اسلام بدعتوں کے جس قدر خلاف ہے وہ معلوم ہے حتیٰ کہ اجتہاد جو شریعت کے دائرے میں رہتے

---

[1] اس موضوع پر امام ابن القیم کی تحقیق مختصر سنن ابی داؤد ۳/۲۹۷ حدیث نمبر ۲۳۱۳ میں دیکھی جائے۔

ہوئے کیا جاتا ہے، اس میں بھی اگر خطا رہے تو اس کی اتباع غلط ہے ــــ اگرچہ مجتہد کو ثواب ضرور ملے گا، جب آیت "اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ" ۹: ۳۱ اتری تو حضرت عدی بن حاتم نے حضور سے عرض کیا کہ وہ غیر اللہ کی عبادت تو نہیں کرتے تھے؟ حضورؐ نے فرمایا "عبادت نہیں کرتے تھے لیکن ان کے غلط حلال و حرام پر عمل کرتے تھے"، وہ کہتے ہیں کہ مذاہب کی افسانہ طرازیوں کی دو بنیادیں ہیں، ایک یہ کہ جو مذہب نہیں تھا اُسے مذہب سمجھ لیا گیا، دوسرے یہ کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا گیا، اسی لئے امام احمد نے شریعت کی تعریف اس طرح کی ہے کہ بندوں کے اعمال کی دو قسمیں ہیں، عبادات جنھیں وہ فلاح آخرت یا فلاح دارین کے لئے برتتے ہیں، دوسری عادات، یا معاملات جن کا تعلق خاص طور سے دنیاوی زندگی سے ہوتا ہے، تو عبادات کی اصل یہ ہے کہ اس میں شریعت کے عبادتی نظام کی پیروی کی جائے، اور عادات میں یہ ہونا چاہیئے کہ ان میں حلت و حرمت کا اختیار خدا کو دینا چاہیئے، اس قاعدہ اور نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کی حقیقت افسانوں میں گم دکھائی دیتی ہے:

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت، رہِ افسانہ زدند

اسلام اور بدعت کا کھلا تضاد

بعض سہل انگار حضرات بدعت کی تقسیم حسنہ اور قبیحہ سے کرتے ہیں، ان کی دلیل ہے کہ حضرت عمرؓ نے تراویح کے لئے "نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ" (یہ اچھی بدعت

ہے) کہا تھا، دوسری دلیل یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد زمانے کے مطابق اسلام میں جو باتیں اپنالی گئیں وہ بھی تو بدعت ہیں لیکن "حسنہ" ہیں اس لئے ان پر کوئی نکیر نہیں کرتا۔
"بدعت حسنہ" کی بعض لوگ یہ تعریف کرتے ہیں کہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں شریعت خاموش ہے، یا ان میں کوئی مصلحت ہے، اس سے زیادہ بدعتِ حسنہ کی تائید میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ان کہنے والوں نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ آنحضورؐ صراحتہً "کل بدعۃٍ ضلالۃ وکل ضلالۃٍ فی النار" فرما رہے ہیں مگر یہ لوگ اس کی تقسیم کرنے پر لگے ہوئے ہیں۔

جب شارعؑ نے بدعت کا برائی کے معنوں میں استعمال متعین فرما دیا تو یہ کہنا کہ بعض برائیاں اچھی بھی ہوتی ہیں، اپنی جسارت و جرأت بلکہ حماقت ہی کا ثبوت دینا ہے، اوپر کے اعتراضات کا جواب یہ ہے کہ بدعت میں حسن ہو ہی نہیں سکتا اور جس میں حسن ہے وہ بدعت نہیں، اور جو یہ سمجھتا ہے کہ بدعتوں اور جدتوں پر اگر اجماع ہو جائے تو اسے حق بجانب (JUSTIFY) کہا جا سکتا ہے وہ خود حق بجانب نہیں، اس لئے کہ بدعتوں اور غلطیوں پر پوری امت کا اجماع ہو ہی نہیں سکتا اور نہ اسے تاریخی طور پر کوئی ثابت کر سکتا ہے، اس لئے کہ سنت کے ادا شناس ہر دور و دیار میں ہمیشہ موجود رہے ہیں جنھوں نے بدعتوں پر روک لگائی ہے، پھر مقدس اجماع اگر کہیں کا ہو سکتا ہے تو وہ اہل مدینہ کا ہو سکتا ہے لیکن جمہور علماء نے انکو بھی یہ اختیار نہیں دیا ہے بلکہ عام مسلمانوں کے مقام سے وہ برتر نہیں اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ان بدعتوں پر عوام کالانعام اور جاہل ہوس پرستوں کا

اجماع مستند (AUTHORITY) ہے یا اس کا کچھ بھی وقار و اعتبار ہے۔

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ حدیثِ بدعت کے عموم کو مخصوص بدعتوں کے معنی میں لینا صحیح نہیں، اس لئے کہ پھر اس حدیث کے معنی ہی نہیں رہ جاتے اگر بدعت سے صرف منہی عنہا چیزیں ہی مراد لی جائیں تو پھر کفر وفسق کے علاوہ کوئی چیز بدعت کی مصداق ہی نہیں رہ جائیگی اور اس کا اطلاق صرف عہد نبوی کی غلطیوں پر ہوگا، حالانکہ یہ صراحۃً غلط ہے، اس تاویل میں متعدد خرابیاں ہیں۔

۱۔ اس حدیث سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اس لئے ممنوعہ اشیاء تو کسی مخصوص نہی سے ممنوع ہوں گی پھر اس حدیث سے کوئی چیز ممنوع نہیں ہو سکتی، اور حدیث بے فائدہ ہو کر رہ جائیگی حالانکہ حضور اسے خطبۂ جمعہ میں پابندی کے ساتھ پڑھتے اور اسے جوامع الکلم میں شمار فرماتے تھے۔

۲۔ لفظ "بدعت" ایک بہت معصوم لفظ بن جائے گا، اور اس کے وجود و عدم کے کوئی معنی ہی نہیں رہ جائیں گے۔

۳۔ اس سے قائل کی (معاذاللہ) تدلیس وتلبیس ثابت ہوگی، کیونکہ بدعت ایک عام لفظ اور نہی ایک مخصوص صفت ہے تو عام بول کر خاص مراد لینا یا خاص کہہ کر عام کی طرف اشارہ "لال بجھکڑوں" کا مشغلہ ہے، نبیؐ ایسی گول مول باتیں کر ہی نہیں سکتا۔

۴۔ اگر حدیث سے ہر بدعت کے لئے نہی خاص ضروری ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف چند لوگ بدعتوں کو جان سکیں اور عوام کے لئے اس کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا جائے

۵۔ غیر متعین بدعتوں کی تعداد زیادہ ہے، اس لئے "نہی خاص" کی طلب حدیث

کے عموم کو نظر انداز کرنے کے مرادف ہے۔

نماز تراویح بدعت نہیں

نماز تراویح کے بدعت ہونے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، اس لئے کہ وہ سنتِ قولی اور سنتِ فعلی دونوں اپنی تائید میں رکھتی ہے، حدیث میں ہے "ان اللہ فرض علیکم صیام رمضان وسننت لکم قیامکم" (اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کئے، اور میں نے نماز تراویح مقرر کی) تراویح کی جماعت بھی بدعت نہیں اس لئے کہ حضورؐ نے پہلے رمضان میں تین راتوں میں جماعت سے نماز ادا فرمائی اور آخری دس دنوں میں بھی بارہا جماعت سے تراویح ادا کی، حدیث ہے۔

"ان الرجل اذا صلّی مع الامام حتیٰ ینصرف کتب له قیام لیلة" (جو اسے امام کے ساتھ پڑھتا ہے، اسے پوری رات قیام کا ثواب ملتا ہے) مجتہدین کا کہنا ہے کہ صرف صحابی کا قول حجت نہیں، "قول الصاحب لیس بحجة"۔

پھر جب قول صحابی قولِ رسولؐ کے مخالف پڑتا ہو تو اس کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟

حضرت عمرؓ نے اگر تراویح کے لئے بدعت کا استعمال کیا تو وہ بدعتِ شرعی کے معنوں میں نہیں بلکہ بدعتِ لغوی کے سیاق میں تھا، اس لئے کہ لغت میں بدعت کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "کل ما فعل ابتداءً من غیر مثالٍ سابق" (ہر وہ نئی چیز جو بغیر کسی پہلے نمونے کے وجود میں آئے)

تراویح کی تائید میں جب حضورؐ کے قول و فعل دونوں ہیں تو اسے بدعت کہا ہی نہیں جا سکتا

تراویح کے چوتھے دن حضورؐ نے غایتِ شفقت سے فرمایا "انه لم یمنعنی ان اخرج الیکم:

لا كراهتہ ان يفرض عليكم فصلوا فى بيوتكم فان افضل صلوٰة المرء فى بيتہ الا المكتوبہ" (مجھے صرف اس بات نے جماعت تراویح میں آنے سے روکا کہیں تم پر وہ فرض نہ ہو جائے، بہتر ہے کہ گھر ہی پر پڑھو اس لئے کہ فرض کے سوا باقی نمازیں گھر ہی میں افضل ہیں) فرض ہو جانے کا خوف ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کی زندگی ہی تک تھا، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے منشا نبوی کی تکمیل کی اور مسجد میں روشنی کی گئی۔

اسی طرح "جمع قرآن" آنحضورؐ کے عہد میں منع تھا کہ حدیث سے گڈمڈ نہ ہو جائے اور دوسرے یہ بھی تھا کہ قرآن ابھی مسلسل اتر ہی رہا تھا اور اس میں "نسخ" بھی ہوتا تھا، اس لئے اس خیال سے مصحف میں جمع نہیں کیا گیا کہ بار بار بدلنا خلط مبحث پیدا کر سکتا تھا، لیکن حضورؐ کے بعد اطمینان ہونے پر اسے مصحف کی شکل دی گئی۔

یہ ایسا ہی تھا، جیسا کہ حضرت فاروقؓ نے خیبر کے یہود و نجران کے عیسائیوں کو ارض عرب سے باہر چلے جانے کا حکم دیا اس لئے کہ حضورؐ نے مرض وفات میں فرمایا تھا کہ یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دو" حضرت ابوبکرؓ اس کی تعمیل اہل ردّہ سے قتال کی وجہ سے نہیں کر سکے، اور فارس و روم سے بھی جنگوں کی مشغولیت حائل رہی، شروع میں حضرت عمرؓ بھی اس پر انہی جنگوں کی وجہ سے عمل نہیں کر سکے، لیکن بعد میں اسے نافذ کیا۔

بظاہر تو یہ بدعت معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ یہود خیبر نے ان سے کہا "وكيف تخرجنا وقد اقرنا ابو القاسم"؟ (کہ رسول اللہؐ نے تو ہمیں ٹھہرایا تھا، تو آپ کیوں کر نکلنے کا حکم دے رہے ہیں) حضرت علیؓ کی خلافت میں بھی انھوں نے ان سے رجوع کیا اور خواہش ظاہر کی کہ "کتابك بخطك"

(آپ کے ہاتھ کی تحریر ہونی چاہیئے) لیکن حضرت علیؓ اپنے ارادے سے رکے رہے، اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں بھی اس پر عمل کیا تھا۔

ایسے ہی حضورؐ نے فرمایا تھا:

خذوا العطاء ما کان عطاء فاذا	تم حکام و خلفاء کے عطیات لے سکتے ہو لیکن
کان عوضاً عن دینکم فلا تاخذوہ	جب وہ تمہارے دین کو خریدنے کے لئے دیا جائے تو مت لینا۔

عہد سعادت کے بعد جب خلفاء اور امراء نے خوشامدی درباریوں، اور جی حضوریوں کو جو ان کے لئے دین و شریعت میں باطل تاویلیں اور حیلے تلاش کرتے تھے، بڑے بڑے انعام دینا شروع کئے تو جو علمائے حق اور مردان باصفا اس سے باز رہے، وہ بدعت نہیں تھا، اگرچہ ایک نیا طرز عمل تھا لیکن زمانے کے حالات کی وجہ سے حدیث کے دوسرے ٹکڑے پر عمل تھا، آپؐ نے اہبان بن صیفی کو ایک تلوار دیتے ہوئے فرمایا:

قاتل بہ المشرکین فاذا رأیت	اس سے مشرکین سے لڑنا لیکن جب مسلمان
المسلمین اقتتلوا فاکسرہ۔	آپس ہی میں لڑنے لگیں تو اسے توڑ دینا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تلوار شکنی آنحضورؐ کے عہد میں معروف نہیں تھی، لیکن بعد میں آپ ہی کے حکم کی تعمیل میں پیدا ہوئی اسی طرح حضرت صدیق اکبرؓ کا منکرین زکاۃ سے قتال، ایک بدعت تھی، اس لئے کہ صرف زکوٰۃ کے منکر سے حضورؐ کبھی نہیں لڑے۔ لیکن "امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ" (مجھے حکم ہے کہ جب تک لوگ توحید و رسالت کی گواہی نہ دیدیں مسلسل لڑتا رہوں) اس سے حضرت صدیقؓ نے نکالا کہ زکوٰۃ بھی اس گواہی کا

ایک اہم جز اور رکن رکین ہے، اس کے ساتھ ہی حق اللہ بھی ہے، اس کے علاوہ دوسری حدیث میں "ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکاۃ" (حتی کہ نمازیں پڑھنے اور زکوٰۃ دینے لگیں) کے الفاظ بھی صراحۃً آئے ہیں، اس لئے حضرت صدیقؓ کا عمل بدعت نہیں ہے، اگرچہ محدث (ایک نئی بات) ہے۔

بدعتیں کیونکر ایجاد ہوتی ہیں؟

بدعت کے بارے میں یہ جان لینا چاہیے کہ اس کے مؤجد نیک نیت اور مخلص بھی ہوتے ہیں، اور وہ کسی نہ کسی مصلحت ہی کے لئے بدعت کی ایجاد کرتے ہیں، وہ غلطی کو غلطی جان کر نہیں کرتے بلکہ اسے اپنی دانست میں صحیح سمجھ کر کرتے ہیں، اس کے بعد ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی واقعی نئی ضرورت پیش آتی ہے، جو عہد رسالت میں نہیں آئی تھی، اس لئے آپ نے اس کی ممانعت بھی نہیں کی تھی تو اس مصلحت دینی کو اختیار کیا جاسکتا ہے، اور کیا گیا، اسی طرح بعض بدعتیں اس طرح گوارا کی گئیں کہ ضرورت تو عہدِ نبوت ہی میں محسوس ہو چکی تھی، لیکن کسی وجہ سے آپؐ نے اس کی تکمیل نہیں کی، اس لئے آپ کی وفات کے بعد جب وہ وجہ باقی نہیں رہی تو لوگوں نے اب اس ضرورت کو پورا کیا۔

بدعت کی وہ صورت کہ اس کی ضرورت بھی نہ ہو اور اس میں کوئی معصیت بھی ہو تو اس بدعت کا کوئی جواز ہی نہیں پیدا ہو سکتا، یہاں ایک بات اور بھی ہے کہ ہر وہ بات جو مصلحت سمجھی جا رہی ہے، اگر عہد رسالت میں بھی مصلحت ہی تھی لیکن وہ سنت کا شرف حاصل نہ کر سکی تو وہ بعد میں بھی کبھی مصلحت

نہیں شمار کی جا سکتی، لیکن آپ کی وفات کے بعد جو مصلحتیں پیدا ہوتی ہیں، اور ان میں کوئی دینی قباحت بھی نہیں ہوتی ان پر ضرور غور کیا جا سکتا ہے۔

یہاں پہنچ کر فقہا کے دو گروہ ہو جاتے ہیں: ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر نہی صریح نہیں ہے، تو اس مصلحت کا دین میں اعتبار ہے اسی کو "مصالح مرسلہ" کہتے ہیں، دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ جب تک امر صریح نہیں ہے، تو عمل کیسے کیا جا سکتا ہے؟ پھر اس طبقہ میں بھی دو خیال پیدا ہو جاتے ہیں، ایک خیال ہے کہ کلام شارعؑ سے کوئی دلیل چاہیئے بلا اس کے عمل نہیں کیا جا سکتا، یہ خیال "قیاس" کی نفی پر مبنی ہے، دوسرا خیال یہ ہے کہ شریعت میں اس کی نظیر دیکھ کر یا مفہوم سمجھ کر کوئی کام کیا جائے یہ اہل قیاس کا خیال ہے، جو لوگ کسی نئی چیز کو بلا سوچے سمجھے دین میں داخل کر لیتے ہیں، ان کے بارے میں فرمایا گیا:

ان اخوف ما اخاف علیکم زلۃ عالم وجدال منافق، بالقرآن وائمۃ مضلون۔	سب سے بڑا خطرہ جو تمہارے لئے مجھے محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ عالم کی گمراہی یا منافق کی غلط قرآنی تاویل، اور گمراہ کن امراء کا خطرہ ہے

اس قسم کی مثال عیدین کی اذان ہے، اسے جب امراء نے رواج دیا تو مسلمانوں نے بدعت سمجھ کر اس پر نکیر کی، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کہہ سکتے تھے کہ یہ تو ذکر اللہ اور دعوت حق ہے اس لئے عبادات کے عموم میں اسے داخل کر لینا چاہیئے، اور اللہ تعالےٰ کا ارشاد بھی ہے کہ "اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا" (۳۳ : ۴۱) وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ" (۴۱ : ۳۳) یا اذان جمعہ پر بھی قیاس کر سکتے تھے، اور اسے آسانی سے عیدین کی سنتوں میں داخل

کر سکتے تھے، لیکن آنحضورؐ کے فعل کی طرح دراصل آپؐ کا ترکِ فعل بھی سنت ہے، اس لئے جب حضورؐ نے جمعہ کے لئے اذان دلائی لیکن عیدین کے لئے نہیں، اس لئے یہاں ترکِ اذان واقامت ہی سنت ہے، اور کسی کو حق نہیں کہ وہ اپنی طرف سے اس میں اضافہ کر دے، کیونکہ یہ اضافہ اس طرح کا اضافہ ہوگا کہ کوئی نماز کے اعداد میں اضافہ کر دے، رکعات کی تعداد بڑھا دے، یا حج میں کوئی زیادتی کر دے اگر کوئی من چلا کہنے لگے کہ ظہر کو ۵ رکعات میں اس لئے پڑھنا چاہیئے کہ یہ عملِ صالح ہے تو اسے کون اس کا اختیار دے سکتا ہے؟ اسی طرح دعا کے لئے اگر اس نے کوئی مخصوص جگہ بنائی ہے تو اسے بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا، اور نہ وہ اسے "بدعت حسنہ" کہنے کا مجاز ہے، یہاں شیخ الاسلامؒ نے ایک ایسا جملہ لکھا ہے، جو انہی جیسا کوئی شریعت کا رمز آگاہ لکھ سکتا تھا؛ لکھتے ہیں:

ونحن نعلم ان هذا ضلالة قبل ان نعلم نهيا خاصا عنها او ان نعلم ما فيها من المفسدة،	ہم پر اس بدعت کی ضلالت اس کے لئے کسی نہی کے علم اور مفسدہ کی خبر سے پہلے ہی واضح ہے۔

یہاں تک تو اس صورت کی وضاحت تھی کہ امر حادث میں کوئی مصلحت ہو یا اس کے لئے کوئی شرعی رکاوٹ نہ ہو، اب وہ صورت رہ جاتی ہے جو کہ بعد کے لوگ اسے مصلحت سمجھتے ہیں، اور عہد رسالت میں بھی مصلحت میں داخل تھی، لیکن آپؐ نے اسے عمل کی شکل نہیں دی تو اس میں ترک ہی سنت ہے۔

اس قسم کی بدعتوں میں عیدین کے خطبہ کا پہلے پڑھنا ہے، جسے امراء نے رائج کیا تو مسلمانوں نے اسے کھلے عام بدعت کہا، اگرچہ لوگ اس کی وجہ بتاتے ہیں کہ

حضورؐ کے زمانے میں لوگ خطبہ شوق سے سنتے تھے، اور بلا سنے عیدگاہ سے نہیں جاتے تھے، لیکن بعد کے لوگ سلام پھیر کر ہی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، اس لئے خطبہ ان کو پہلے ہی سنا دینا چاہیئے، لیکن یہ تو کج فہمی کا مظاہرہ ہے، اس لئے کہ خطبوں میں بدمزگی تو آج کے اماموں کی پیدا کردہ ہے جنھیں کوئی شعور ہی نہیں، آنحضورؐ تو اپنے خطبہ میں لوگوں کے فائدے کا خیال رکھتے اور ان کی تبلیغ و ہدایت کا سامان کرتے تھے لیکن آج کے اماموں کا مقصد یہ ہے کہ اپنی "امامت" کا مظاہرہ کریں، دینی خدمت اور اصلاح تو ان کے پیش نظر ہوتی ہی نہیں ہے، معلوم ہوا کہ عوام کو تو آپ نے خود بیزار کیا اور اب انھیں مائل کرنے کے لئے دوسری معصیت کا سہارا لے رہے ہیں، اس کا صحیح حل تو یہی ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی طرف ہم رجوع کریں اس کے بعد بھی اگر عوام کی اصلاح نہیں ہوتی تو فکر کی کیا بات ہے، آپ کو تو صرف اپنے عمل کا جواب دینا اور اپنا حساب صاف دکھانا ہے۔

اوپر کی دو باتیں جو سمجھ لے گا، اس پر بدعت کا فہم آسان ہو جائے گا، ہمیں نے اوپر بھی اشارہ کیا ہے کہ شریعتیں قلب کی غذا ہوتی ہیں، اور جب یہ غذا اسے بدعت کی شکل میں ملتی ہے تو پھر اس میں سنت کے لئے گنجائش نہیں رہ جاتی۔

"وان الشرائع اغذیة القلوب فمتی اغتذت القلوب بالبدع لم یبق فیها فضل للسنن فتکون بمنزلة من اغتذی بالطعام الخبیث" (۲۸۱)

انھوں نے لکھا ہے کہ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ امراء اور سلاطین نے اسلامی نظام حکمرانی میں جب بدعتوں کو راہ دی تو اس کے نتیجے میں اس نظام کی خوبیاں ختم ہو گئیں اور انھیں اپنی سلطنت کے لئے طرح طرح کے جرائم کا ارتکاب کرنا پڑا، اور اپنی حفاظت

کے لئے حفاظتی دستہ (BODY GUARD) رکھنا پڑا۔

اسی طرح علما اور فقہا کی بدعتوں کے بارے میں بھی انھوں نے اظہار خیال کیا ہے کہ اگر وہ کھلے دل سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور سنت کے ذخیرے سے فائدہ اٹھاتے تو علم کا ایک بحرِ محیط نظر آتا جو ایک عالم کو سیراب کر سکتا تھا۔

اور وہ خود متکلمین کی ان گمراہیوں سے بچے رہتے، جو انھوں نے اصل دین کی حفاظت کے نام سے اختیار کی ہیں، اور جنھیں اہل قیاس فروع دین کی توسیع سمجھتے ہیں

حضرت شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ سنتیں اپنے اندر بدعتوں سے پوری طرح بے نیاز کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں، یعنی اگر سنتوں پر پوری طرح عمل ہو تو بدعتوں کی ضرورت ہی نہ پڑے، ان کا کہنا ہے کہ اگر لوگ گفتار و کردار کی ان بلندیوں کو دیکھ لیں جنھیں خدا نے اپنے رسول کو عطا کی ہیں، تو انھیں اندازہ ہو کہ ان میں کتنے پاکیزہ احوال و مقامات، اور نتائج و برکات ہیں، لیکن ان کا تو حال یہ ہے کہ اپنے کانوں کو ذوقِ سماع سے محروم کر چکے ہیں، اب قرآن سننے میں ان کو کیسے لطف آئے، کچھ جو اذکار و اوراد وظائف اور اشغال میں پھنسے ہوئے ہیں، انھیں دین خالص کی جھلک کیسے دکھائی دے سکتی ہے؟

وہ فرماتے ہیں کہ اصل مقصد تو دلیل صحیح کا علم ہے، اگرچہ اس کا تارک بھی اپنے اجتہاد کی وجہ سے معذور ہوتا ہے بلکہ مقام صدیقیت میں بھی فائز ہو سکتا ہے لیکن "صدیق" کے لئے ضروری نہیں کہ اس کی ہر بات صحیح اور اس کا ہر کام درست اور سنت ہو اس لئے کہ یہ تو صرف سنت کا مقام ہے ــــ اس کے بعد شیخ الاسلامؒ نے عید کی بعض بدعتوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض لوگ رجب کی پہلی جمعرات کو

روزہ رکھتے ہیں اور اس جمعہ کی رات میں "صلاۃ الرغائب" پڑھتے ہیں اور عید کی طرح خوشیاں مناتے ہیں، یہ سب خالص بدعت ہے۔

قیاس کے تین مقیاس

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ ایک قیاس وہ ہوتا ہے کہ شریعت کوئی حکم دیتی ہے اور اس کی علت وسبب بھی بتا دیتی ہے، جیسے حضورؐ نے بلی کے جھوٹے کے لئے فرمایا: "انہا لیست بنجس انہا من الطوافین علیکم والطوافات" (وہ نجس نہیں بلکہ وہ تمہارے ساتھ رہنے والی ہے) اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی اپنے غلام کو ہدایت کرے کہ میرے گھر میں فلاں کو داخل مت کرنا کیونکہ وہ بدعتی ہے یا کالا ہے۔ تو اس سے علت بدعتی ہونا، یا کالا ہونا معلوم ہو گئی۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شریعت حکم کی علت تو نہیں بتاتی لیکن اس کی نظیر کی علت بتا دیتی ہے، جیسے اس نے باپ کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنی نابالغ بچی کا نکاح بلا اس سے پوچھے کر سکتا ہے، اسی طرح وہ اس کے مال کا مالک بھی بن سکتا ہے، تو کیا ہم اس سے سمجھ سکتے ہیں کہ ولایت نکاح کی علت بچی کی نابالغی ہے؟ یا اس کے مال کی ملکیت کی علت بھی یہی ہے؟ یا ہم ان کی کوئی اور علت نکال سکتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ "کنوارپن" ولایت کی علتِ منصوص ہے جس کو "ملکیت" کی علت بھی سمجھا گیا، اور ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ہم بغیر خاص دلیل کے دو چیزوں کی علت ایک نہیں مان سکتے۔ اس لئے مختلف علتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ جیسے حضورؐ نے بیع کرنے، مول بھاؤ کرنے اور پیغام نکاح میں مسابقت کرنے سے روکا ہے۔ اس کی علت دو مسلمانوں کے درمیان تعلقات کی ناخوشگواری ہے،

اسی طرح آپؐ کا حکم ہے "لا تنکح المرأۃ علی عمتها، ولا علی خالتها، فانکم اذا فعلتم ذالك قطعتم ارحامکم" (کسی عورت کا اس کی خالہ اور پھوپھی کے ساتھ نکاح نہ کیا جائے، اگر تم ایسا کرو گے تو نا اتفاقی پیدا کر دو گے)

اس کے بعد وہ بدعتیں ہیں، جن کی علتیں بھی منصوص ہیں، جیسے حضورؐ نے نماز اور روزہ کے لئے اپنی طرف سے کسی خاص وقت کی پابندی کو مکروہ سمجھا ہے، صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا،

لا تخصوا لیلۃ الجمعۃ بقیام من اللیالی، ولا تخصوا یوم الجمعۃ بصیام من بین الایام الا ان یکون فی صوم یصومہ احدکم۔	قیام لیل، اور روزہ کے لئے جمعہ کو خاص نہ کرو مگر یہ کہ جمعہ تمہارے سلسلۂ نماز وصیام میں اتفاقاً پڑ جائے تو کوئی حرج نہیں۔

صحیحین میں انہی سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جمعہ کا روزہ اس کے آگے پیچھے ایک اور روزہ کے ساتھ رکھا کرو۔

صحیحین میں محمد بن عباد سے اور حضرت ابن عباسؓ سے ایسی ہی روایات ہیں اور صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ رمضان سے ایک دو دن پہلے روزے نہیں رکھنا چاہئیں ——— روزے کے لئے شریعت نے دنوں کے ۳ حصے کئے ہیں، ایک قسم واجب روزوں کی ہے جیسے رمضان، یا مستحب روزوں کی جیسے عرفہ اور عاشوراء کے روزے۔

ایک قسم وہ جس میں روزے مطلقاً منع ہیں، جیسے عیدین اور ایک قسم وہ جسے خاص طور پر منع کیا ہے، جیسے جمعہ اور اواخر شعبان کے روزے، اس آخری تقسیم میں یہ ہے کہ

اگر دوسرے روزے بھی رکھے جائیں تو ان کی کراہت ختم ہو جاتی ہے ــــــ اس سے ظاہر ہوا کہ فساد کی جڑ اس امر کا بدعت ہونا ہے جو بغیر کسی وجہ تخصیص کے خاص کر دینے سے پیدا ہوئی ہے، جمعہ اور رمضان سے پہلے دنوں میں چونکہ فضیلت کی وجہ سے یہ عمل کیا جا سکتا ہے، اس لئے شریعت نے اسے روک دیا۔ غرض کوئی شخص غیر ارادی طور پر بھی ان دنوں میں روزے رکھتا ہے تو وہ کراہت سے خالی نہیں ہو سکتے، یہ بدعت چوتھی صدی ہجری کے بعد رائج ہوئی اس لئے اسے قطعاً بدعت ہی کہا جائے گا۔

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ بدعتیں دراصل اعتقاداتِ واجبہ اور اعمال شرعیہ کی ضد واقع ہوئی ہیں اور وہ لازماً شارع علیہ السلام کی مخالفت پر مبنی ہوتی ہیں، اور بالآخر آدمی میں نفاق پیدا کر کے رہتی ہیں۔

اس کی مثال یوں ہے کہ بعض لوگ ابوجہل اور عبداللہ ابن ابی بن سلول کی امارت و ریاست سے مرعوب اور ان کے احسان مند تھے، اور جب آنحضورؐ نے ان کی مخالفت کا حکم دیا تو ان کے دلوں میں رسول اللہ سے منازعت کا جذبہ پیدا ہوا اور بعض اندر ہی اندر الجھ کر رہ گئے اور اس طرح اپنا ایمان خراب کر لیا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بدعت کفر ہی کی ایک شاخ ہے۔

بعض لوگ بدعت کی وکالت اس طرح کرتے ہیں کہ آخر اس میں تو نماز، روزہ، ذکر و شغل، اوراد و وظائف، حسن نیت و اخلاص وغیرہ پایا جاتا ہے تو کیا یہ سب کارت جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر قصداً اور عمداً کوئی بدعت سمجھ کر یہ نہیں کرتا بلکہ اجتہادی غلطی سے کرتا ہے تو ثواب یقیناً مل جائے گا لیکن کراہت بھی بہرحال باقی رہے گی اور بدعت کی سیاہی رنگ لائے گی۔

اس سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ہر برائی میں کوئی نہ کوئی اچھائی بھی پوشیدہ ہے حتی کہ کفار بھی اپنی عبادتوں میں کوئی نہ کوئی فائدہ محسوس کرتے ہیں لیکن بڑا حصہ نقصان ہی پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

ہم تو بدعتوں میں یہی کہتے ہیں کہ "اثمهما اکبر من نفعهما" ان کا گناہ ان کے نفع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، ربا اور نبیذ کی بعض مختلف فیہ صورتیں اگرچہ موجب گناہ نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی شرط ہے کہ اس کے شرائط سے اچھی طرح واقف ہو، اپاجیوں کی پیروی نہ کرتا ہو اور نہ دین کے بارے میں عاجلانہ مزاج رکھتا ہو، بدعت کے مفاسد اوپر بھی لکھے گئے ہیں اس کے ساتھ مزید کہا جاسکتا ہے کہ بدعت میں بعض اوقات نفس کو لذت ملنے لگتی، اور طبیعت کو چسکا پڑجاتا ہے، اسی لئے بعض اہل بدعت کو دیکھا جاتا ہے کہ فرض اعمال ان کے لئے بوجھ ہوتے ہیں لیکن اوراد و اشغال وہ بڑے شوق سے پورے کرتے ہیں۔ قرآن کی تلاوت چھوٹ سکتی ہے لیکن حزب البحر اور دعائے گنج العرش کا ناغہ کبھی نہیں ہوسکتا، اور پھر عوام وخواص پر بدعتوں کا ایسا غلبہ ہوجاتا ہے کہ فرائض وسنن میں جو انہماک مطلوب تھا، اس کا رخ بدعتوں اور جدتوں کی طرف ہوجاتا ہے، گویا وہ بدعت کو تو عبادت سمجھ کر لیکن فرائض وسنن کو عادت کے طور پر انجام دینے لگتے ہیں، اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ فرائض وسنن میں جو رحمت ومغفرت، رقت وانابت، طہارت وخشوع، تضرع وابتہال، عبدیت کی کیفیت اور دعا ومناجات کی لذت وحلاوت ہے اس سے محرومی ہی ہاتھ آتی ہے۔

اسی کے ساتھ معروف ومنکر کا معیار جس طرح مشتبہ ہوجائے گا آسمانی دین سے جہل جس قدر بڑھے گا اور اس کے نتیجے میں "جاہلیت" کی جڑیں جس طرح مضبوط ہوجائیں گی

اس کا اندازہ ہر اسلام پسند کرسکتا ہے۔

انہی مفاسد میں یہ شرعی مکروہات بھی ہیں جنھیں بدعتی برتتے ہیں جیسے افطار میں تاخیر، نماز عشاء میں غفلت اور اس کے لئے عجلت بغیر ضرورت سجدۂ سہو، بے اصل اوراد و اذکار کی پابندی، اس کے علاوہ بیشمار بدعتیں ہیں جنھیں طبع مستقیم اور قلب سلیم کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ سب سے بڑی خرابی جو بدعت سے دل میں سما جاتی ہے وہ شریعت کے مقابلہ میں خود رائی، اور اتباع رسولؐ کی جگہ نفس و خواہش کی پیروی ہے اس لئے کہ انسان طبعاً آزادی پسند واقع ہوا ہے اس لئے وہ ہر قسم کی تقلید سے پیچھا چھڑا لینا چاہتا ہے، ابو عثمان نیشاپوریؒ نے اسی لئے کہا تھا:

ماترك احدٌ شيئاً من السنة الا لكبرٍ في نفسه۔ — بلا کبر نفس کے کوئی سنت کا ترک نہیں کرتا۔

عید کی بدعتیں

اوپر بتایا گیا ہے کہ عید، زمان و مکان اور اجتماع کا نام ہے، زمانے کے لحاظ سے جو بدعتیں عید میں راہ پاگئی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ بے اصل طور پر کوئی نئی عید ایجاد کرلی جائے، جیسے رجب کی پہلی جمعرات اور اس جمعہ کی رات کی تعظیم جس کا نام "رغائب" رکھا جاتا ہے، یہ بدعت چوتھی صدی ہجری کے بعد رائج ہوئی، اور اس کے لئے ایک موضوع حدیث مشہور کی گئی۔

اسی طرح وسط رجب میں "صلاۃ ام داؤد" پڑھنے کی بدعت بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہے، ۱۸ ذی الحجہ کو حجۃ الوداع سے واپس آتے ہوئے "غدیر خم" کے پاس

آنحضرتؐ نے خطبہ دیا تھا جس میں آپ نے کتاب اللہ کی اتباع، اور اہل بیت کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی تھی جسے زید بن ارقمؓ سے مسلمؒ نے روایت کی ہے۔

اس کی اصل بس اتنی ہی تھی لیکن عوام میں شیعوں نے یہ مشہور کیا کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ کے لیے بطور خاص فرش بچھوایا اور ان کو اس پر بٹھایا تھا اور اس طرح گویا آپ کی خلافت کی توثیق کی تھی لیکن صحابہ نے اس وصیت کو چھپا دیا اور حضرت علیؓ سے خلافت غصب کر کے کفر و فسق کا ارتکاب کیا لیکن صحابہؓ کی امانت و دیانت دیکھتے ہوئے کوئی شخص اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا بلکہ خود اہل بیت نے بھی اس کی طرف کہیں کوئی اشارہ تک نہیں کیا، آنحضرتؐ کے خطبہ کی وجہ سے اسے عید کے طور پر منانے کا جواز کسی طرح نہیں پیدا ہو سکتا اس لئے کہ آنحضرتؐ ہر اہم موقع پر خطبہ اور وصیت فرماتے تھے، یہ تو یہود و نصاریٰ کی عادت ہے کہ وہ اپنے نبی کے ہر اہم واقعہ کے لئے ایک عید منانا ضروری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ "عید" تو شریعت ہی مقرر کر سکتی ہے۔

انہی بدعتوں میں میلاد کی بدعت بھی ہے جو دوسری قوموں کی تقلید میں انجام دی جاتی ہے یا پھر اس کی بنیاد محبت رسولؐ ہوتی ہے، اگر محبت رسول ہے تو اس پر ثواب ملے گا[ل] لیکن چونکہ اس کی شکل بدعت ہے اس لئے اس کی کراہت بھی باقی رہے گی اس بدعت کا تو عجیب حال ہے، یعنی محدثین اور مورخین آپؐ کی تاریخ ولادت کے بارے میں مختلف رائیں رکھتے ہیں لیکن میلاد کے لئے خود تاریخ متعین کر لی گئی ہے،

ل کتاب کے محشی استاذ حامد الفقی نے یہاں اختلاف کیا ہے کہ بدعت میں ثواب کیسے ملے گا؟ اور اسے خطا اجتہادی کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے، بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ رسول اللہ کی اصل محبت ان کی اتباع ہے نہ کہ ارتکاب بدعت۔

اگر اس کی شریعت میں کوئی بنیاد ہوتی تو ظاہر ہے کہ سلف اسے ضرور منعقد کرتے، ان اہل میلاد کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ جتنا ہی میلاد میں گرم جوش ہیں اتنے ہی اتباع سنت میں سست کوش! ان کی مثال اس طبقہ کی طرح ہے جو قرآن کو خوب سجاتا اور سنوارتا ہے، لیکن اسے پڑھنے کی زحمت کبھی نہیں کرتا، یا بعض لوگ مسجد تو "شب بھر" میں بنانے کی ہمت رکھتے ہیں، لیکن دو رکعت نماز بھی ان کے لئے بوجھ ہوتی ہے۔ حدیث میں انہی کے لئے آیا ہے کہ:

ماساء عمل امة قط الا زخرفوا مساجدهم۔	جب کسی امت نے اپنی مسجدوں کو سجایا ہے تو ان کے اعمال میں خرابی آئی ہے۔

شیخ الاسلامؒ نے یہاں فرمایا ہے کہ جس طرح بدعت بری ہے اسی طرح ترکِ سنت بھی کسی برائی میں کم نہیں۔

اسی سلسلے میں ایک بات یہ بھی ہے کہ اہل بدعت میں اگر محبت رسولؐ ہے تو اس کی قدر کرنی چاہیئے اور اس کی اصلاح کر کے انھیں اتباع سنت پر لگا دینا چاہیئے، امام احمدؒ کو بتایا گیا کہ فلاں امیر نے کوئی قرآن مجید ایک ہزار دینار میں تیار کرایا ہے، تو امام نے اس کی قدر کی اور فرمایا کہ یہ رقم قرآن ہی پر خرچ ہوئی اس لئے اور دوسرے مصارف سے تو بہتر ہے۔ حالانکہ ان کا مسلک یہ ہے کہ قرآن مجید کی مبالغہ آمیز آرائش مکروہ ہے۔

انہی بدعتوں میں یوم عاشورار، یوم عرفہ، عیدین، رمضان کا عشرۂ اخیر، ذی الحجہ کے عشرۂ اول، یوم جمعہ، عشرۂ محرم، کی بدعتیں ہیں، عاشورا میں شیعوں کے اثر سے پیاسا رہنا، غم منانا، مجلس پڑھنا وغیرہ ہوتا ہے لیکن شرعًا اس کا کوئی ثبوت نہیں،

لیکن جب اللہ تعالیٰ نے جگر گوشۂ رسولؐ اور نور دیدۂ بتولؓ اور اہل بیت کو فساق و فجار کے مقابلے میں عزت دی اور مسلمانوں کے احساسات کو صدمہ پہنچا تو اہل بدعت نے اسے دوسرا رنگ دیدیا، جو مصائب کے وقت اسلام کی تلقین کے خلاف تھا۔

امام احمد اور ابن ماجہ نے فاطمہ بنت حسین سے روایت کی ہے:

من اصیب بمصیبۃ فذکر مصیبتہ فاحدث استرجاعا وان تقادم عھدھا کتب اللہ لہ من الاجر مثلھا یوم أصیب۔	اگر کوئی مصیبت میں مبتلا ہوا اور پھر کبھی اپنی مصیبت یاد کرکے اس نے انا للہ پڑھا تو اگرچہ کتنی ہی پرانی بات کیوں نہ ہوگئی ہو لیکن اللہ تعالیٰ مصیبت کے دن کے جیسا اجر اسے دوبارہ دیتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام کا مزاج ماتم کے خلاف ہے۔ اس موقع پر جو لوگ غسل کرتے، سرمہ لگاتے، اور مصافحہ کرتے ہیں، وہ بدعت کرتے ہیں سنت تو صرف روزہ رکھنا ہے۔

ابراہیم بن محمد بن منتشر سے اس دن کے بارے میں ایک روایت نقل کی جاتی ہے:

بلغنا انہ من وسّع علی اھلہ یوم عاشوراء وسّع اللہ علیہ سائر سنۃ (رواہ ابن عیینہ)	جو یوم عاشوراء کو اپنے گھر کے خرچ میں زیادتی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سال بھر اس کے لئے زیادتی رزق فرماتے ہیں۔

لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ بے سند حدیث ہے، اور یہ اس وقت گڑھی گئی، جب خارجیوں اور شیعوں کا اختلاف عروج پر آگیا تھا، صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ "ثقیف میں ایک کذاب اور غارتگر پیدا ہوگا" اس کا مصداق مختار بن ابی عبید تھا جو حضرت حسینؓ

کا حامی بنتا تھا لیکن کتاب وسنت کے مخالف رویہ اور حضرت علیؓ کے ساتھ غلو نے اسے کہیں کا نہ رکھا، ابن ناصر نے بعض ایسی روایتوں کی توثیق کی ہے لیکن اس کا اعتبار نہیں۔

انہی بدعتوں میں "رجبی شریف" کا منانا بھی ہے، وہ اشہر حرم (احترام کے مہینوں) میں سے ضرور ہے، لیکن اس کے لئے جو بدعتیں ایجاد کی گئی ہیں وہ غلط ہیں، آنحضرتؐ سے اس ماہ کے بارے میں آتا ہے:

انہ کان اذا دخل شہر رجب	جب رجب کا مہینہ شروع ہوتا تو آپؐ
قال: اللھم بارك لنا فی شہری	فرماتے: اے اللہ! رجب اور شعبان کے
رجب وشعبان وبلغنا رمضان	دونوں مہینوں میں ہمارے لئے برکت عطا فرما
	اور ہم کو رمضان المبارک دیکھنا نصیب کر

اس حدیث کے سوا رجب کی فضیلت میں کوئی اور دوسری حدیث ثابت نہیں اور جتنی حدیثیں کہی جاتی ہیں سب کی سب وضع کردہ ہیں، حدیث کے سلسلہ میں یہ ہے کہ اگر اس کا جھوٹ ثابت نہ ہو تو فضائل کے بیان میں اس سے مدد لی جا سکتی ہے، لیکن دوسری صورت میں اس کے مرتبہ کی صراحت ضروری ہے کہ حدیث کیسی ہے اور اس کی سند کیسی ہے؟ بعض سلف سے البتہ رجب کے عشرۂ اول کی فضیلت ثابت ہے لیکن اسے حدیث کا درجہ کیسے مل سکتا ہے؟ اس لئے اس میں خاص طور پر روزہ رہنا امام احمدؒ کے ہاں مکروہ ہے، جیسا کہ شیخینؓ اور دوسرے صحابہؓ سے مروی ہے، ابن ماجہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے رجب کے روزے سے منع فرمایا ہے۔

۱۵ / شعبان کی فضیلت میں بھی بدعتوں کا سہارا لیا گیا ہے، اگرچہ مرفوع حدیثوں

میں خود ہی اس کے بہت سے فضائل آئے ہیں، سلف میں بعض لوگ اس کے لئے نمازوں کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ اور اس کے علاوہ شعبان کے روزوں کے بارے میں احادیث صحیحہ بھی ہیں۔ تاہم علمائے سلف اور اہل مدینہ اس کی فضیلت کا انکار کرتے، اور اس سلسلہ کی حدیثوں کی صحت میں بھی تامل کرتے ہیں، جیسے اس حدیث کے بارے میں جس میں کہا گیا ہے کہ "اللہ تعالے اس ماہ میں بنی کلب کی بکریوں کے بال سے بھی زیادہ لوگوں کی مغفرت کرتا ہے۔"

شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ اکثر اہل علم اور اکثر علمائے حنابلہ کا رجحان اس کی فضیلت ہی کی طرف ہے اور سنن و مسانید میں کچھ احادیث مروی بھی ہیں، البتہ صرف ۱۵ر شعبان کے روزہ کی کوئی اصل ثابت نہیں بلکہ صرف اسے رکھنا مکروہ ہے، اسی طرح اس دن کا حلوہ مانڈا اور دوسری خرافات سب بدعت میں شامل ہیں، اسی طرح "صلاۃ الفیہ"[1] کے لئے جو اسی رات کو پڑھی جاتی ہے اجتماع عام کرنا بھی بدعت ہے، اس کے لئے وہ ایک نفل نماز ہے جس کے لئے وقت، عدد اور قرأت کی مقدار کا تعین، ہر چیز بدعت ہے اور اس نماز کے بارے میں تمام احادیث موضوع اور مخترع ہیں، اور اس پر تمام علمائے حدیث کا اجماع ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے ہر رات میں کوئی نماز ایجاد کرلی جائے، جیسے بعض لوگ اول رجب کی نماز پڑھتے ہیں اور بعض دیہاتوں میں مغرب کے بعد مغرب ہی کی طرح ایک اور نماز ہوتی ہے، جیسے برّ الوالدین کی نماز کہتے ہیں اسی طرح بعض من چلے بلا مردہ کے نماز جنازہ پڑھتے ہیں اور یہ نیت کرتے ہیں کہ تمام مسلمان مردوں کی طرف سے یہ نماز ادا ہوگی۔

---

[1] "صلاۃ الفیہ" میں ایک ہزار بار قل ہو اللہ پڑھی جاتی تھی۔

نفل نماز کے لئے یا تلاوت واذکار کے لئے اگر کبھی کبھی اتفاقیہ کوئی اجتماع ہوجاتا ہے تو یہ ایک اچھی چیز ہے اس لئے کہ آنحضورؐ سے ثابت ہے کہ آپ نے کبھی کبھی نفل کی نماز بھی جماعت سے ادا کی ہے، ایسے ہی آپؐ سے یہ بھی ثابت ہے کہ ذکر کی ایک مجلس میں آپ سننے والوں کے ساتھ مل کر بیٹھ گئے اور آپؐ سے اس قوم کی فضیلت ثابت ہے جو کتاب وسنت کا مذاکرہ کرتی ہے ـــــ یا وہ جماعت جو ذکر الٰہی میں مشغول ہوتی ہے۔

جیسے یہ حدیث وارد ہوئی ہے:

ما جلس قوم فی بیت من بیوت	جب کوئی جماعت کہیں قرآن کی تلاوت کرتی
اللہ یتلون کتاب اللہ ویتدارسو نہ	یا اس کے مطلب پر غور کرتی ہے تو رحمت
...... بینھم الا غشیتھم الرحمۃ	انھیں ڈھانک لیتی ہے ان پر سکینت کا نزول
ونزلت علیھم السکینۃ وحفتھم	ہوتا ہے، فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالے
الملائکۃ وذکرھم اللہ فیمن عندہٗ	ملائکہ مقربین میں ان کا ذکر کرتا ہے۔

اسی کے ساتھ ایک اور روایت میں ان ملائکہ کا ذکر ہے جو مجالس ذکر کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب ذاکرین کی کسی جماعت کو دیکھ لیتے ہیں تو اپنے ساتھیوں کو پکارتے ہیں کہ یہاں آؤ یہاں ہماری ضرورت کا سامان ہے (الذین یلتمسون مجالس الذکر فاذا وجدوا قوما یذکرون اللہ تنادوا: ھلموا الی حاجتکم) لیکن ان مجالس اور مواقع کے لئے کوئی تاریخ مقرر کرلینا اور اس کی پابندی کرنا بدعت ہے، ابوبکر الخلال.. کتاب الادب میں اسحاق بن منصور الکوسج سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ سے کہا یہ تو مکروہ ہے کہ لوگ ذکر اللہ کیلئے

جمع ہوں اور دعا کے لئے اپنے ہاتھ اٹھائیں؟ اس پر امام احمدؒ نے فرمایا کہ اگر لوگ اتفاقیہ جمع ہو جائیں تو میں اسے مکروہ نہیں سمجھتا لیکن اگر کثرت سے وہ ایسا کریں تو اسے مکروہ کہا جائیگا۔ (۳۰۴) اسحاق بن راہویہ کی بھی یہی رائے ہے ۔۔۔ مروزی فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے پوچھا کہ اگر کوئی جماعت کسی قاری سے کچھ سنتی اور دعاؤں میں رات گزارتی ہے تو کیسا ہے؟ امامؒ نے فرمایا کہ میرے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں: ارجو ان لا یکون بہ بأس۔ ابو السری الحربی کہتے ہیں کہ امام احمد فرماتے تھے:

وای شئ احسن من ان یجتمع الناس یصلون ویذکرون ما انعم اللّٰہ بہ علیھم کما قالت الانصار؟	اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے کہ لوگ جمع ہو کر ذکر و نماز میں مشغول ہوں اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد کریں جیسا کہ انصار کا معمول تھا۔

اس روایت میں انصار کے اس معمول کی طرف اشارہ ہے جسے محمد بن سیرینؒ نے روایت کی ہے کہ:

نبئت ان الانصار قبل قدوم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المدینۃ قالوا: لو نظرنا یوماً فاجتمعنا فیہ فذکرنا ھذا الامر الذی انعم اللّٰہ بہ علینا، فقالوا: یوم السبت ثم قالوا لا نجامع	مجھے روایت پہنچی کہ حضورؐ کی مدینہ تشریف آوری سے قبل انصار نے ذکر کے لئے ایک خاص دن مقرر کرنا چاہا تو بعض لوگوں نے کہا شنبہ اس کے لئے ٹھیک رہے گا تو اس پر اکثریت نے کہا کہ ہم یہود کے دن میں مصروف ذکر نہیں ہوں گے بعض لوگوں نے یکشنبہ کی

الیھود فی یومھم قالوا فیوم الاحد	رائے دی تو اسے بھی نصاریٰ کا دن کہہ کر
قالوا: لا نجامع النصاریٰ فی یومھم	رد کر دیا گیا، اس کے بعد لوگوں نے کہا عربوں
قالوا فیوم العروبة، وکانوا یسموں	کے دن میں کیوں نہ اسے رکھا جائے؟ (جمعہ
یوم الجمعة یوم العروبة فاجتمعوا	کو عربوں کا دن کہا جاتا تھا) چنانچہ اسی دن
فی بیت ابی امامہ أسعد ... بن زرارہ	اسعد بن زرارہؓ کے گھر میں لوگ جمع ہوئے
فذبحت لھم الشاة فکفتھم۔	اور ایک بکری کا گوشت ان کے کھانے میں

کافی ہوگیا۔

ابن مسلم طرسوسی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ سے پوچھا کہ اگر کچھ لوگ جمع ہوں اور ایک آدمی غمیں لہجہ میں تلاوت کرے اور دوسرے سن کر روئیں اور چراغ بجھا دیں تو کیسا ہے؟ امامؒ نے فرمایا، اگر ابو موسیٰ کی طرح پڑھا جائے تو کچھ حرج نہیں۔

خلال امام اوزاعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کسی غیر متعین دن میں اجتماعی ذکر و شغل کی اجازت دی ہے۔

سندی الخواتیمیؒ نے امام احمد سے پوچھا کہ آثار و مقابر پر جانا کیسا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ ابن مکتوم کی اس روایت کے بموجب کہ وہ اپنے گھر کو مسجد بنانا چاہتے ہیں یا ابن عمرؓ کی روایت کہ وہ آنحضرت کے آثار و نقش قدم اور آپ کی فرودگاہوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ ان دونوں روایتوں کو دیکھتے ہوئے اس کی اجازت ہے لیکن لوگوں نے اس میں غلو سے کام لینا بھی شروع کر دیا ہے۔ احمد بن قاسم نے ان سے آثار مدینہ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے یہی جواب دیا۔ اور حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں یہ روایت پیش کی کہ:

یتبع مواضع سیر النبی وفعلہ	وہ ان جگہوں اور ان باتوں کی تلاش میں
حتی روئی یصب فی موضعٍ ماء	رہتے تھے جن سے آنحضرتؐ کا تعلق ہوتا تھا
فسئل عن ذالک فقال رأیت	چنانچہ ایک بار انھیں ایک جگہ پانی بہاتے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	دیکھ کر پوچھا گیا تو فرمایا کہ میں نے آنحضورؐ کو
یصب ھٰھنا ماءً۔	یہاں پانی بہاتے دیکھا تھا۔

لیکن امام احمد پابندی کو بدعت ہی کہتے ہیں اس لئے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے جب لوگوں کو پابندی سے ایک جگہ ذکر کرتے دیکھا تو فرمایا:

یا قوم لانتم اھدی من محمد	مجھے بتاؤ کہ کیا تم محمد رسول اللہؐ سے بھی زیادہ
اولانتم علی شعبۃ ضلالۃٍ۔	ہدایت یافتہ ہو گئے ہو یا گمرہی کی ایک راہ
	پر چل پڑے ہو؟

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ وہ شرعی عبادات و تقریبات جو بار بار آتی رہتی ہیں بندوں کو دوسری تقریبات سے بے نیاز کر دیتی ہیں، لیکن اس کے بعد بھی نئی عیدوں اور بدعتوں کو رائج کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آدمی نئی شریعت ایجاد کرنا چاہتا ہے صحابہؓ نے اسی شبہ سے بچنے کے لئے صوم رجب پر روک لگائی، اور حضرت عمرؓ نے بیعت رضوان کے یادگار درخت کو کٹوانے کا حکم دیا۔ اسی طرح جب انھوں نے لوگوں کو آنحضور کے مقام نماز پر نماز کے لئے ہجوم کرتے دیکھا تو سختی سے منع کر دیا۔ اور فرمایا:

اتریدون ان تتخذ وا آثار	کیا تم اپنے نبیؐ کے آثار کو سجدہ گاہ بنانا
أنبیاءکم مساجد۔	چاہتے ہو؟

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح نفل کے لئے اوقات کی پابندی اور جماعت سازی کرنا بدعت ہے اسی طرح آثار و مشاہد کی زیارت کی پابندی بھی بدعت ہے[1]، جو قلیل و کثیر، ظاہر و خفی، اور معتاد و غیر معتاد کے فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے، اسی طرح جو شے اصلاً مشروع ہے لیکن پابندی کرنے سے وہ بھی بدعت بن جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ان مواقع پر مسجد میں شور و غل، مردوں اور عورتوں کا مخلوط مجمع، چراغاں اور روشنی، اور نمازیوں کی توجہ میں کسی طرح خلل ڈالنا یہ سب بدعت کی شکلیں ہیں، اور ان کا حکم بھی ممنوعات مسجد، (بیع و شرار، شعر خوانی، اور اقامت حدود وغیرہ) کی طرح ہے، شیخؒ فرماتے ہیں کہ "صلاۃ الفیہ" کے حق میں بعض متاخرین حنابلہ کی رائے ملتی ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر حدیث کی حیثیت کی طرف نہیں گئی۔

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ عبادات کی تین قسمیں ہو جاتی ہیں، ایک جو خصوصی طور پر مستحب ہیں جیسے فجر کی سنتیں، اور تراویح، اسی میں تہجد بھی داخل ہے، اسی کی دوسری قسم وہ ہے، جو کسی سبب کے ساتھ متعلق ہوتی ہے، جیسے صلاۃ استسقاء، اور صلاۃ الآیات (جو کسی عظیم واقعہ اور حادثۂ فطرت کے وقت پڑھی جائے جیسے زلزلہ، سیلاب، وغیرہ کے وقت) پھر یا تو شریعت کی طرف سے اس کی تعداد بھی متعین ہوتی ہے جیسے وتر کی نماز، اور مطلق ہوتی ہے، جیسے جمعہ کی نماز سے پہلے کی نوافل، اس طرح بقیہ اقسام کی نو قسمیں ہو جاتی ہیں۔

عبادات کی دوسری قسم وہ ہے جو اپنے معنی کے لحاظ سے مستحب ہو جیسے نفل نمازیں،

---

[1] یہاں شیخ حامد الفقی محشی کتاب نے یہ اختلاف کیا ہے کہ نوافل اور ذکر و تلاوت تو مسنون و مشروع ہیں لیکن آثار و مقابر اور مشاہد کی زیارت کہاں مشروع ہے؟

تیسری وہ جو علیحدہ مکروہ لیکن دوسری نمازوں کے ساتھ مل کر مستحب ہو جاتی ہیں، جیسے جمعہ کے دن قیام لیل، اور کبھی نماز مطلق مکروہ ہوتی ہے لیکن مخصوص حالات میں اس کی اجازت بھی دیدی جاتی ہے جیسے اوقات مکروہہ میں نماز کے بارے میں دو رائیں ہیں کہ آیا وہ اس لئے مکروہ ہیں کہ لوگ کہیں عام طور پر ان اوقات میں نماز نہ پڑھنے لگیں یا یہ کہ وہ مطلق منع ہیں، مگر ضرورت کے مطابق کبھی رخصت بھی دیجاتی ہے؟ امام احمدؒ سے دونوں رائیں ثابت ہیں۔

عید مکانی[1] کی بدعتیں

شیخؒ فرماتے ہیں کہ کبھی عملی عید کی بدعتوں کے ساتھ کسی مخصوص مقام کی قید بھی لگالی جاتی ہے، جو خروج عن الشریعت، اور بے دینی تک پہنچا دیتی ہے، جیسے عرفہ کے دن کچھ خوش عقیدہ لوگ بعض صالحین کے مزاروں کا رُخ کرتے اور عرفہ مناتے ہیں، ایسے ہی عرفہ کے لئے بیت المقدس کا سفر کرتے ہیں۔ قدس کی زیارت نماز اور اعتکاف کے لئے مشروع ہے لیکن ایام حج میں اس کا قصد مکروہ ہے، اس لئے کہ اس کی زیارت کا کوئی متعین وقت نہیں، اسے کعبہ کا مقام دینا کسی طرح صحیح نہیں، جیسا کہ بعض جاہل "صخرہ" کا طواف کرتے اور سر منڈاتے ہیں، ایسے ہی بعض جبل رحمت کے "قبہ" کا طواف بھی کر بیٹھتے ہیں اور بعض ارباب "حال" "مسجد اقصیٰ" میں سماع اور دف بجانے کا شغل انجام دیتے ہیں، عرفہ کے دن اپنے شہر کی مسجد میں نماز و دعا کے لئے جانا ابن عباسؓ اور

---

[1] عید مکانی سے مراد وہ عیدیں ہیں جو کسی مخصوص مقام پر انجام دی جاتی ہیں اب تک جن بدعت عیدوں کا بیان تھا، وہ وقت و زمانہ سے متعلق تھیں، اس لئے انھیں "عید زمانی" کہا جا سکتا ہے۔ مرتب

عمرو بن حریثؓ سے ثابت ہے۔ بصرہ و مدینہ کے کچھ علماء بھی اس کے قائل ہیں اور امام احمدؒ نے بھی رخصت دی ہے لیکن وہ اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

لیکن کوفہ اور مدینہ کے بعض علماء جن میں ابراہیم نخعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ بھی شامل ہیں اسے مکروہ کہتے ہیں، مروزی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ کو کہتے سنا کہ آدمی کو دعا خفیہ طور پر مانگنا چاہیئے، وہ اسے صحابہ کی رائے بھی قرار دیتے تھے۔ خلال نے قتادہؒ اور سعید بن مسیبؒ سے صحیح سند سے روایت کی ہے کہ،

احدث الناس الصوت عند الدعاء — لوگوں نے دعا کے ساتھ بلند آوازیں ایجاد کر لی ہیں۔

سعید بن عروبہ سے روایت ہے کہ مجالد بن سعید نے کچھ لوگوں کو دعا میں غلو کرتے دیکھا تو ان کے پاس گئے اور کہا لوگو! اگر سلف کے عمل کے ساتھ یہ زیادتی کروگے تو گمراہ ہو جاؤ گے چنانچہ وہ لوگ ایک ایک کرکے چپکے سے کھسک گئے۔

ابوالتیاح کہتے ہیں میں نے امام حسنؒ بصری سے پوچھا ہمارا امام وعظ کہتا ہے اور لوگ آخر میں زور سے دعائیں مانگتے ہیں تو امام نے فرمایا۔

ان رفع الصوت بالدعاء لبدعة — زور سے دعا مانگنا بدعت ہے۔

وان مد الایدی بالدعاء لبدعة — دعا کے لیے ہاتھ پھیلانا بدعت ہے۔

وان اجتماع الرجال والنساء لبدعة — مردوں اور عورتوں کا مخلوط اجتماع بدعت ہے

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا اختلافی مسئلہ ہے، اور اس کے متعلق مختلف حدیثیں ہیں، امام فرماتے ہیں کہ سنت پر کوئی نہیں عمل کرتا لیکن بدعت کی طرف سب لپکتے ہیں، عید کی تکبیروں اور مردوں کے بعد عورتوں کو خطاب کرنے کی سنت،

عیدگاہ کے پاس ہی قربانی کرنے کی سنت وغیرہ کو کوئی انجام نہیں دیتا۔ حالانکہ دین تو معروف کے کرنے اور حکم دینے اور منکر سے رکنے اور روکنے ہی کا نام تھا ـــــ

فان الدين هو فعل المعروف والامر به وترك المنكر والنهى عنه۔

شیخ فرماتے ہیں کہ عید مکانی کی پھر ۳ قسمیں ہو جاتی ہیں جیسے عید زمانی کی تین اقسام تھیں، ایک وہ جس کی شریعت میں کوئی خصوصیت نہیں، دوسری وہ جس میں خصوصیت تو ہے لیکن عبادت بدعت ہے، تیسری وہ جس میں عبادت ہے لیکن عید منانا نہیں ہے، ان تینوں کے بارے میں آثار مروی ہیں، جیسے مقام بوانہ پر ایفائے نذر کی رخصت آپؐ نے دی۔ یا فرمایا کہ میری قبر کو عیدگاہ مت بنانا۔ یا یہ کہ حضرت عمرؓ کا انبیا کے آثار کو عیدگاہ بنانے سے روکنا۔ اس لئے ذکر و دعا اور نماز کے لئے کسی مقام کو خاص کرنا کھلی گمراہی ہے۔ اور اگر اس میں کفار و مشرکین کے بھی آثار ہیں تب تو اس کی قباحت اور بڑھ جاتی، اور وہ لات و منات کی عبادت بن جاتی ہے۔

شیخ فرماتے ہیں کہ ان بتوں کی تقسیم بھی علاقائی تھی۔ لات اہل طائف کا خدا تھا، جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ایک نیک آدمی تھا جو حجاج کو ستو کھلاتا تھا، جب وہ مرا تو لوگوں نے اس کی قبر پر اس کا بت نصب کیا اور اس مقام کو "بیت الربہ" کا نام دیا، فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسے منہدم کیا۔

عزیٰ عرفات کے قریب واقع اور اہل مکہ کی دیوی تھی، آنحضورؐ نے خالد بن ولیدؓ کے ذریعہ اس کا استیصال کرایا اور وہاں کے خزانہ کو تقسیم فرمایا، اس وقت وہاں سے ایک پریشان حال اور ژولیدہ مو شیطانہ کو دیکھا گیا جو بھاگی چلی جارہی تھی، مناۃ اہل مدینہ کی دیوی تھی جس کی جے پکاری جاتی تھی۔

جو مشرکین کے حالات اور بعثت کے وقت عرب کے احوال سے آگاہ ہونا اور شریعت کو سمجھنا چاہتا ہے اسے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت، عرب کی تاریخ، اور ازرقی وغیرہ کی کتابیں دیکھنا چاہئیں، وہ فرماتے ہیں کہ کسی مخصوص عبادت گاہ اور مقام کے لوگوں پر صدقہ کی نذر ماننا بھی بدعت اور مشرکین سے مشابہت ہے اس لئے کہ حضرت ابراہیم ؑ نے ان بتوں کے پجاریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ۔ (۲۱:۵۲)

ان بتوں کی حقیقت ہی کیا ہے جن کے استھانوں پر دھرنا دیے بیٹھے ہو؟

شیخ فرماتے ہیں کہ مزاروں کے پیروں، فقیروں، مجاوروں کو ہدیہ اور نذرانہ دینا گرجا کے راہبوں، مندروں کے سنیاسیوں اور پنڈتوں، اور بدھ کے استوپ کے چیلوں کو نذرانہ دینے کے مرادف ہے۔

چند بدعت گاہوں کی نشاندہی

بدعتی حلقوں میں ہمیشہ نامعلوم مزاروں کو کسی مشہور و معروف شخصیت کی طرف منسوب کر کے عوام کی توجہ اپنی طرف کر لیجاتی ہے اور اس طرح اکل حرام کا کاروبار چل نکلتا ہے۔

دمشق میں پوربی دروازہ سے باہر ابی بن کعبؓ کی شہادت گاہ کہی جاتی ہے حالانکہ اہل علم متفق ہیں کہ ان کی وفات دمشق میں نہیں بلکہ مدینہ منورہ میں ہوئی ہے ایسے ہی جامع دمشق کی مغربی دیوار کے پاس حضرت ہودؑ کی قبر بتائی جاتی ہے لیکن میں کسی اہل علم کو نہیں جانتا جو حضرت ہودؑ کی موت کو دمشق میں بتاتا ہو بلکہ یمن اور مکہ کا نام

کیا جاتا ہے، آپ کی بعثت یمن میں اور ہجرت مکہ کی طرف ہوئی تھی، لیکن شام سے آپ کا کوئی تعلق نہ تھا۔

دمشق کے مغربی دروازے پر اویس قرنیؒ کی قبر کہی جاتی ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ حضرت اویسؒ نے دمشق میں وفات پائی تھی، اور نہ وہ یہاں کبھی آئے تھے، بلکہ وہ یمن سے عراق آئے تھے، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ صفین میں ان کی شہادت ہوگئی تھی، کچھ کہتے ہیں کہ ان کی موت نواحئ ایران میں ہوئی۔

ایسے ہی ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی قبر مشہور ہے لیکن ان کا کبھی دمشق آنا ہی ثابت نہیں، اس لئے کہ وہ آنحضرتؐ کے بعد سفر کرتی ہی نہیں تھیں، بلکہ یہ ام سلمہ، اسماء بنت یزید بن سکن انصاریہ ہو سکتی ہیں۔ اس لئے کہ اہل شام جیسے شہر بن حوشب جب ان سے روایت کرتے ہیں تو انھیں "ام سلمہ" ہی کہتے ہیں۔ جو حضرت معاذ بن جبلؓ کی چچیری بہن اور اعیان صحابیات میں تھیں، یا یہ ام سلمہ، یزید بن معاویہؓ کی بیوی ہو سکتی ہے، لیکن وہ علم ودین کے لحاظ سے شہرت نہیں رکھتی تھی ــــــ اس لئے یہ امکان بعید ہے۔

قاہرہ میں ایک مدفن راس حسینؓ کے نام سے مشہور ہے اس کی اصل یہ ہے کہ عسقلان میں ایک قبر تھی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس میں حضرت حسینؓ کا سر اقدس مدفون ہے جسے قاہرہ لیجا کر دفن کیا گیا لیکن یہ سب بالکل غلط اور افواہ ہے، اسی سلسلہ میں "قدمِ رسول" کی "دریافت" جگہ جگہ ہوتی نظر آتی ہے۔[1]

---

[1] ہندستان میں بھی متعدد مقامات پر "قدمِ رسولؐ" کے نام پر قدموں کے نشان اور ان پر عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں، بہرائچ میں میں نے ایک عمارت میں اسے دیکھا جس میں پتھر پر ایک بڑے پاؤں اور ہاتھ کی چھاپ کھود کر نمایاں کی گئی ہے، اور اسے قدمِ رسولؐ مشہور کیا گیا ہے ــ مرتب

صخرۂ بیت المقدس کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ اس میں آنحضرتؐ کے نقش قدم موجود ہیں، دمشق کی "مسجد قدم" میں حضرت موسیٰؑ کا نقشِ قدم بتایا جاتا ہے، لیکن یہ بھی غلط ہے، اس لئے کہ حضرت موسیٰؑ دمشق اور اس کے اطراف میں کبھی تشریف نہیں لائے، اسی طرح اگر کسی مقام پر کسی نبی یا ولی کی خواب میں زیارت ہو جاتی ہے تو اس مقام کو بھی مقدس سمجھا جانے لگتا ہے، بعض مقامات پر کسی مرد صالح کی تصویر یا اس کے کسی عضو کی تصویر بنا کر اس سے برکت طلب کی جاتی ہے، جیسے دمشق میں ایک "مسجد الکف" مشہور تھی، اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ نقش کف حضرت علیؓ کے ہاتھ کا نقش ہے، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ خود بخود ڈھے گیا۔

حجاز میں بدر سے مکہ جاتے ہوئے دائیں ہاتھ پر ایک غار مشہور ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہی غار ہے جس میں آنحضرتؐ اور حضرت صدیقؓ نے پناہ لی تھی، لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ وہ غار ہے جو مکہ کے قریب جبل ثور میں واقع ہے، ان مقامات کا حکم "مسجد ضرار" کی طرح ہے، جس میں کھڑا ہونا اور نماز پڑھنا منع فرما دیا گیا تھا۔

اہل علم کے ایک حلقہ کا خیال یہ ہے کہ انبیاء میں صرف نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک متعین اور محفوظ ہے، اور کسی نبی کی نہیں، لیکن بعض لوگ حضرت ابراہیمؑ کی قبر ثابت کرتے ہیں، دمشق کے باب صغیر کے پاس صحابہؓ کے مزارات کہے جاتے ہیں، لیکن ان کی تعیین مشکل ہے، اس کے ساتھ ہی ان مقامات کو مقدس سمجھنا اور پابندی سے ان پر حاضری دینا ان کے لئے نذر ماننا بالکل غیر اسلامی شعار ہے، نذر کے بارے میں حضورؐ فرماتے تھے:

انہ لا یاتی بخیر وانما یستخرج بہ البخیل۔ — کہ اس میں کوئی بھلائی نہیں مگر یہ کہ اس سے بخیل کے پاس سے بھی کچھ نکل آتا ہے۔

اجابت دعا کے لئے جان لینا چاہیئے کہ اس کا سبب کبھی دعا گو کا اضطرار و تضرع، اور اس کی مخلصانہ التجا، ہوتی ہے کبھی محض اللہ تعالےٰ کی رحمت ہوتی ہے کبھی وہ تقدیری طور پر انجام پاتا ہے اور کبھی دوسرے اسباب بھی ہوتے ہیں، اسی لئے دعا کے مطابق پورا اترنا ایک بڑی آزمائش ہے کفار کی دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں لیکن یہ ان کے لئے ہلاکت ہی ہوتی ہیں۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا — ہم آپ کے رب کی عطا سے سب کو دیتے ہیں، اور آپ کے رب کی عطا کسی پر بند نہیں۔

(۲۰:۱۷)

بعض مقامات کی خصوصیت ہے لیکن انھیں عید گاہ اور عبادت گاہ بنانا روحِ اسلام کے منافی ہے، ان جگہوں میں انبیا اور صالحین کی قبریں ہیں، لیکن قبروں کے بارے میں آنحضرت ؐ کی تعلیم ہے:

لا تجعلوا بیوتکم قبوراً ولا تجعلوا قبری عیداً وصلوا علیّ فان صلاتکم تبلغنی حیثما کنتم۔ (ابوداؤد) — اپنے گھروں کو قبرستان بناؤ اور نہ میری قبر کو عید گاہ بناؤ، مجھ پر درود پڑھو تم جہاں سے بھی درود پڑھوگے وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔

ابو یعلیٰ موصلیؒ نے ابوبکر بن ابی شیبہؒ سے روایت کی ہے کہ علی بن حسینؓ (امام زین العابدینؒ) نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ مزار شریف کے ایک کونہ میں داخل ہو کر دعا مانگتا تھا آپ نے اسے روکا اور مذکورہ بالا حدیث سنائی۔

سعید بن منصور نے بھی اپنی سنن میں یہی روایت بیان کی ہے، ان کی دوسری روایت یہ ہے کہ ابن ابی سہیل کو حسنؓ بن حسنؓ نے قبر مبارک کے پاس دیکھ کر بلایا اور پوچھا قبر کے پاس کیا کر رہے تھے، میں نے کہا سلام عرض کر رہا تھا اس پر آپ نے فرمایا کہ جب مسجد میں داخل ہو اسی وقت سلام کہہ لیا کرو اور پھر آپ نے وہی روایت اس اضافہ کے ساتھ بیان کی۔

لعن اللہ الیھود اتخذ وا قبور انبیاءھم .... مساجد ما انتم ومن بالاندلس الا سواء۔	خدا یہود پر لعنت کرے کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا، تم اور جو اندلس میں ہیں وہ برابر ہیں (یعنی جہاں سے درود بھیجو گے پہنچ جائے گا)

اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ روئے زمین پر قبر نبوی سے زیادہ باعظمت اور کوئی قبر نہیں لیکن اس کے لئے بھی آنحضورؐ نے سختی سے کسی میلے اور عرس سے روک دیا، تو پھر اور کس کی قبر کے لئے یہ سب جائز ہو سکتا ہے۔

پھر یوں بھی درود و سلام پہنچانے کے لئے جسمانی حاضری کی ضرورت نہیں اس لئے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ درود جہاں سے بھی پڑھا جائے وہ ان تک پہنچتا اور خدمت اقدس میں پیش کیا جاتا ہے۔

ابوداؤدؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے:۔

ما من احد یسلم علی الا رد اللہ علی روحی حتی ارد علیہ السلام صلی اللہ علیہ وسلم۔	جب کوئی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح مجھے لوٹا دیتا ہے جسکے سبب میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں کہ خدا اس پر بھی رحمت وسلامتی نازل کرے

ابوداؤدؒ ہی نے اوس بن اوسؓ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

اکثروا من الصلاۃ علیّ یوم الجمعۃ	جمعہ کے دن رات میں مجھ پر کثرت سے درود
ولیلۃ الجمعۃ فان صلاتکم معروضۃ	بھیجو اس لئے کہ تمہارا درود مجھے پیش کیا جاتا
علیّ۔ قالوا: یارسول اللّٰہ کیف	ہے، لوگوں نے حیرت سے پوچھا کہ آپ کا جسم
تعرض صلاتنا علیک وقد ارمت؟	تو فنا ہو چکا ہوگا؟ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا
فقال: ان اللّٰہ حرّم علی الارض	اللہ تعالٰی نے زمین پر انبیاء کے جسم کو حرام کر دیا
ان تاکل لحوم الانبیاء۔	ہے۔

مسند ابن ابی شیبہؒ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

من صلّی علیّ سمعتہ ومن صلّی علیّ	جو مجھ پر درود پڑھتا ہے میں اسے سنتا ہوں، اور
نائیاً بلغتہ۔ (دارقطنی)	جو دور سے درود پڑھتا ہے اسے مجھ تک پہنچا دیا
	جاتا ہے۔

نسائی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

ان اللّٰہ وکل بقبری ملائکۃ	اللہ نے میری قبر کے لئے ایسے فرشتے مقرر کئے
یبلغون عن امتی السلام۔	ہیں جو مجھ تک میری امت کے سلام پہنچاتے ہیں۔

اس کے علاوہ متعدد حدیثیں ہیں جن کا مفہوم یہی ہے۔

عام مسلمانوں کی قبروں کا یہ حکم ہے کہ وہ قابل احترام ہوتی ہیں اس لئے کہ وہ مسلمان میت کا مکان ہیں جن پر بالاتفاق نجاست نہیں ڈالی جا سکتی، نہ انھیں روندا جا سکتا ہے، نہ ان پر تکیہ لگایا جا سکتا ہے، نہ اور کسی قسم کی توہین کی اجازت دی جا سکتی ہے اور نہ وہاں بدکلامی وغیرہ کی اجازت ہے، بلکہ قبرستان میں کلام اور دعا کا حکم ہے

بریدہ بن حصیبؓ فرماتے ہیں کہ جب حضورؐ کسی قبرستان میں جا نکلتے تو فرماتے :۔

السلام علی اھل الدیار من المومنین والمسلمین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون نسأل اللہ لنا ولکم العافیۃ (مسلم)

اہل مقام کے مومنین و مسلمین پر سلام ہم بھی انشاء اللہ آپ سے ملنے والے ہیں، ہم اللہ سے اپنے اور آپ کے لئے عافیت کی دعا کرتے ہیں۔

دوسری روایت میں "یرحم اللہ المستقدمین منا والمستاخرین" کے الفاظ زیادہ ہیں۔

ابن ماجہ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے، میں نے آنحضورؐ کو بقیع میں کہتے سنا :۔

السلام علیکم دار قوم مومنین انتم لنا فرط ونحن بکم لاحقون اللھم لا تحرمنا اجرھم ولا تفتنا بعدھم۔

مومن قوم کے گھر پر سلام۔ تم ہمارے پیشرو اور ہم تم سے ملنے والے ہیں، اے اللہ ہمیں انکے اجر سے محروم نہ رکھ اور ہمیں ان کے بعد آزمائش میں نہ ڈال۔

ابن عباسؓ سے مدینہ کے قبرستان کے سلسلے میں آنحضرتؐ کی دعا اس طرح مروی ہے :۔

السلام علیکم یا اھل القبور یغفر اللہ لنا ولکم انتم سلفنا ونحن بالأثر (احمد و ترمذی)

اے قبر والو تم پر سلام۔ اللہ ہماری تمہاری مغفرت کرے تم سلف ہو اور ہم تمہارے پیچھے ہیں۔

ابوداؤد کی حدیث ہے کہ جب کسی مردے کا شناسا اس کی قبر سے گزرتا اور سلام

کرتا ہے، تو اس کی روح لوٹا دی جاتی ہے، اور وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

تلقین میت کو دفن کے بعد لوگوں نے اچھا سمجھا ہے اگرچہ اس کی حدیثیں اس پایہ کی نہیں لیکن حنابلہ نے بھی جائز کہا ہے، ابن بطہ نے الابانہ میں نافع کی روایت لکھی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو میں نے .. اسے زائد مرتبہ مزار شریف پر آتے اور کہتے سنا ہے کہ نبی پر سلام ہو، اور ابو بکرؓ کو سلام، اور میرے باپ عمرؓ کو سلام ہو۔

زیارت قبر فی الجملہ جائز ہے حتی کہ کفار کی قبروں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے، صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ: حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے اپنی والدہ کے لئے استغفار کی اجازت چاہی تو مجھے نہیں ملی لیکن زیارت کی اجازت ملی۔

دوسری روایت ہے:

زار النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبر امہ فبکی وابکی من حولہ فقال استاذنت ربی ان استغفر لہا فلم یاذن لی، واستاذنتہ فی ان ازور قبرہا فأذن لی فزوروا القبور فانہا تذکر الموت	نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی زیارت کے موقع پر روئے اور آپ کے ساتھ کے لوگ بھی روئے پھر آپ نے فرمایا کہ میں نے دعائے مغفرت کی اجازت چاہی تھی لیکن صرف زیارت کی اجازت ملی۔ قبروں کی زیارت کرو کیوں کہ وہ موت کو یاد دلاتی ہے۔[1]

حدیث "لا تشد الرحال" کے پیش نظر مقابر و مزارات اور مساجد ثلثہ کے

---

[1] قبروں کی زیارت کی پہلے ممانعت تھی بعد میں اس شرط کے ساتھ اجازت ملی کہ وہ موت اور آخرت کو یاد دلاتی ہے اگر کسی مسلم اور غیر مسلم کی قبر کی زیارت، عبرت و موعظت کے لئے نہ ہو بلکہ عزت و عظمت اور خراج عقیدت کے خیال سے اور ہار پھول چڑھانے کے لئے ہو تو اس کی اجازت اس حدیث سے نہیں معلوم ہوتی۔ مرتب

علاوہ کے لئے سفر ممنوع ہے، بُصرہ بن ابی بُصرہ غفاریؓ نے جب حضرت ابوہریرہؓ کو کوہ طور کی زیارت سے واپس آتے دیکھا تو فرمایا کہ "اگر میں نے پہلے آپ کو دیکھا ہوتا تو وہاں جانے نہ دیتا، اس لئے کہ حضورؐ نے شد رحال سے منع فرمایا ہے۔"

دوسرا گروہ مجوزین کا ہے، جن میں غزالیؒ، ابوالحسن بن عبدوس الحرانی، ابومحمد مقدسی ہیں۔

شیخ الاسلامؒ نے فرمایا ہے کہ قبروں کی بے جا تعظیم کی ہر صورت کو شریعت نے اسی لئے ناپسند کیا ہے کہ وہ شرک کی سنگِ بنیاد ہے، اگلی امتوں کی گمراہیاں یہیں سے شروع ہوئیں کہ انھوں نے اپنے صالحین اور بزرگوں کی وفات کے بعد ان کی یادگاریں MEMORIALS بنا کر انھیں "خراج عقیدت" پیش کرنا ضروری سمجھا رفتہ رفتہ یہ عقیدت عبادت سے بدل گئی اور باقاعدہ ان کے مجسموں، بتوں اور تصویروں کی پوجا ہونے لگی، عرب کے مشہور بت "لات" اس نام کا ایک صالح آدمی جب مرا اس کے مریدوں نے اس کی پوجا شروع کر دی، اسی طرح، ود، سواع، یغوث، یعوق، اور نسر، حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیان گزرے ہوئے صالح لوگ تھے جن کی بعد میں پوجا ہونے لگی۔ محمد بن جریر طبریؒ نے اس موقع کی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "یہ صالح لوگ تھے جن کے مرنے کے بعد ان کے پیرؤوں نے یہ طے کیا کہ ان کی تصویریں عبادت کے وقت ہمارے سامنے رہیں تو خیال کو جمانے میں آسانی ہوگی، اور عبادت کا لطف بھی بڑھ جائے گا۔ اور جب یہ طبقہ مرا تو شیطان نے بعد کے لوگوں کو یہ سمجھا دیا کہ تمہارے اسلاف تو انہی بتوں اور تصویروں ہی کی پوجا کرتے اور مشکلات میں مدد مانگتے تھے، چنانچہ اس طرح باقاعدہ شرک کا آغاز

ہوگیا، قتادہ کی رائے ہے کہ یہ بُت حضرت نوحؑ کی قوم کی ایجاد تھے، جن کی روایت پر عربوں نے بھی ان کی پوجا شروع کر دی، شیخ الاسلامؒ کا کہنا ہے کہ احترام و تعظیم کے بارے میں بھی اسلامی تعلیمات اعتدال اور توازن کا نمونہ ہیں:۔

ولکن دین اللہ بین الغالی فیہ	خدا کا دین افراط اور تفریط کے درمیان ہے،
والجافی عنہ فان النصاریٰ عظموا	نصاریٰ نے انبیاء کی ایسی تعظیم کی کہ ان کی عبادت
الانبیاء حتی عبدوھم وعبدوا	کرنے اور ان کی تصویروں کو پوجنے لگے، اور
تماثیلھم والیھود استخفوا بھم	یہود نے ان کی ایسی توہین کی کہ ان کو قتل میں
حتی قتلوھم والامۃ الوسط عرفوا	بھی کوئی باک نہیں تھا، امت وسطیٰ نے انبیاء
مقادیرھم فلم یغلوا فیھم غلو	کی عظمت کا صحیح ادراک کیا اس لئے نہ انھوں نے
النصاریٰ ولم یجفوا عنھم جفاء	نصاریٰ کی طرح غلو کیا نہ یہود کی طرح بے رخی
الیھود ولھذا قال صلی اللہ علیہ	برتی، اس لئے حضورؐ نے فرمایا: مجھے اس طرح
وسلم فیما صح عنہ: لا تطرونی	نہ بڑھا دینا جیسے نصاریٰ نے عیسیٰؑ کو بڑھایا
کما اطرت النصاریٰ عیسیٰ بن مریم	میں تو صرف ایک بندہ ہوں، مجھے خدا
وانما انا عبد، فقولوا عبد اللہ	کا بندہ اور اس کا رسول ہی سمجھو۔
ورسولہ۔	

قبروں پر دعا کا حکم

شیخ الاسلامؒ یہ تصریح کرتے ہوئے کہ ان کے مسلک میں قبروں کے پاس نماز صحیح نہیں ہوتی فرماتے ہیں کہ قبروں پر دعا مانگنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اتفاقاً

کسی وجہ سے قبر کے پاس دعا کا موقع آگیا جیسے کوئی دعا کرتا ہوا راستہ میں جا رہا تھا کہ کوئی قبر آگئی تو اس میں کوئی حرج نہیں، دوسری شکل یہ کہ یہ سمجھ کر کہ فلاں کی قبر کے پاس دعا زیادہ قبول ہوگی تو یہ قطعاً ممنوع ہے۔

اور یہ روایت کہ اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا باھل القبور (جب تم مشکلات میں گھر جاؤ تو اہل قبور سے مدد مانگو) یہ بالاتفاق موضوع اور کذب ہے۔

شیخؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی اس ممانعت میں مصلحت یہی تھی کہ دلوں کی رغبت و رہبت اور خوف و طمع کا کوئی تعلق قبروں سے باقی نہ رہے، فرماتے ہیں کہ عام حالات میں ایسی جگہوں پر نماز پڑھنا اتنا برا نہیں جتنا حالت اضطرار و اضطراب میں کسی کا ان قبروں کے پاس دعا مانگنا، اس لئے اس صورت میں بندہ حاجت روائی اور مقصد برآری کے لئے ہر ممکن صورت اختیار کرتا ہے اور اچھے اچھے خوش عقیدہ اور صحیح الخیال لوگ بھی ایسے حالات میں ان حالات کا شکار ہو جاتے، اور نفس انھیں یہ دھوکہ دیتا ہے کہ اضطراری حالات میں تو مردار بھی حلال ہو جاتا ہے حالانکہ یہ نفس کی اتباع کے سوا کچھ نہیں اور اس کا حاصل شرک جلی ہے کہ جس سر کو ایسے وقت میں خدائے رحیم و کریم کے سامنے جھکنا تھا، وہ در گہ غیر پر پڑا ہوا ہے:-

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من! (اقبال)

شیخ فرماتے ہیں کہ یہ قبروں پر دعا کی بدعت تو دوسری صدی ہجری کے بعد کی ایجاد ہے صحابہؓ اور تابعینؒ کے عہد میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا عہد صحابہ میں کئی دفعہ قحط پڑا اور حوادث پیش آئے لیکن قبر نبی ﷺ کے پاس آکر انھوں نے کبھی دعا

نہیں کی بلکہ حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کے وسیلے سے دعا کی حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "انہا کشفت عن قبر النبیؐ لینزل المطر، فانہ رحمۃ تنزل علی قبرہا" (انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سے بارش کے لئے پردہ وغیرہ ہٹا دیا اس لئے کہ بارش بھی خدا کی رحمت ہے جو ان کی قبر پر نازل ہوتی ہے۔)
جب عہد تابعین میں قبر مبارک پر حجرہ کی تعمیر ہوئی تو لوگوں نے قبر کے اوپر کی چھت کو آسمان کی طرف کھلی رکھا جو اب بھی باقی ہے اور اس کے کنارے موم بتیاں لگی رہتی ہیں جنھیں پتھر روکے رہتے ہیں چھت اسی طرح بہت بعد تک کھلی رہی یعنی ۶۵۰ھ کے لگ بھگ جب مسجد و منبر آتشزدگی کے حادثہ سے دوچار ہوئے اور حجاز میں اس غضب کی آگ لگی کہ بصریٰ میں دیکھی جا سکتی تھی، اور اس کے بعد عالم اسلام پر تاتاریوں کا سیل بلا خیز ٹوٹ پڑا تو لوگوں نے پوری چھت تعمیر کر دی اور حجرہ شریف کے گرد لکڑی کی دیوار کھڑی کر دی گئی اور اس کے کئی سال بعد چھت پر قبہ مبارکہ کی تعمیر ہوئی جس کی کچھ علمائے حق نے مخالفت بھی کی۔

محمد بن اسحاق کے مغازی میں ابو العالیہ سے روایت ہے کہ "جب ہم نے تستر فتح کیا تو ہرمزان کے بیت المال میں ایک چارپائی پر ایک مردہ کو دیکھا جسکے سر کے قریب اس کا مصحف رکھا ہوا تھا چنانچہ ہم وہ مصحف حضرت عمرؓ کے پاس لائے آپ نے حضرت کعبؓ کو بلایا تو انھوں نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا میں پہلا عرب تھا جس نے قرآن کی طرح اسے پڑھا میں نے ابو العالیہ سے پوچھا کہ اس میں کیا تھا؟ تو انھوں نے کہا کہ اس میں تم اصحاب نبیؐ کی سیرتیں، حالات حتیٰ کہ تمہاری بولیاں اور تمہارے بعد کے واقعات بھی درج تھے میں نے پوچھا تم نے اس مردہ کو کیا کیا؟ کہا کہ

صبح کو ہم نے ۱۳ قبریں کھودیں اور رات کے وقت ان میں سے ایک میں انھیں دفن کر دیا اور تمام قبروں کو برابر کر دیا تاکہ لوگوں کو پتہ نہ چل سکے، میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں کو کیا ڈر تھا؟ انھوں نے کہا کہ عیسائیوں کو بارش کی ضرورت ہوتی تو اس چارپائی کو باہر نکالتے جس کی وجہ سے بارش ہو جاتی تھی، میں نے پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے؟ انھوں نے کہا کہ انھیں دانیال کہا جاتا تھا، میں نے پوچھا کہ ان کا سن وفات کیا ہوگا؟ انھوں نے کہا کہ وہ تقریباً ۳۰۰ سال پہلے مرے تھے، میں نے کہا کہ ان کے جسم میں کوئی فرق نہیں ہوا تھا؟ انھوں نے کہا نہیں، صرف پیچھے کے چند بال جھڑ گئے تھے، اس لئے کہ انبیاؑ کا جسد اطہر زمین پر حرام ہے اور پرندے بھی اسے نہیں کھا سکتے" مہاجرین وانصار کے اس عمل سے اسلام کے منشا کا اندازہ ہو سکتا ہے، اسی طرح حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا مزار قسطنطنیہ میں مشہور ہے، لیکن صحیح معلوم نہیں، ان کے علاوہ بے شمار صحابیوں کی قبریں عالم اسلام کے اطراف وجوانب میں پھیلی ہوئی ہیں، لیکن کسی تابعی سے ثابت نہیں کہ انھوں نے وہاں دعا کی ہو۔

قبر پرستی کے دلائل کا ابطال

بعض لوگ قبر پرستی اور اس کے متعلقات کے سلسلے میں اس سے استدلال کرتے ہیں کہ حضرت معروف کرخیؒ کے مزار کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ تریاق مجرب ہے اور ان سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنے بھتیجے کو اپنی قبر کے پاس دعا کی وصیت کی تھی، لیکن ابو علی خرقی نے ان لوگوں کا واقعہ بیان کیا ہے جنھیں امام احمدؒ نے چھوڑ دیا تھا، وہ ان کی قبر کے پاس آکر دعائیں مانگتے تھے، غالباً اس واقعہ کو مروزی نے بھی لکھا ہے

اور متاخرین نے لکھا ہے کہ مناسک حج میں قبر نبوی کی زیارت کے موقع پر زائر کو دعا بھی مانگنی چاہیئے، اور کچھ لوگوں نے لکھا ہے کہ جو آدمی ستر بار قبر مبارک کے پاس درود شریف پڑھے اور دعا مانگے تو وہ قبول ہوگی، اور بعض فقہا نے لکھا ہے کہ جب سلام و درود اور ذکر و دعا کی اجازت ہے تو وہاں قرأت قرآن بھی ہو سکتی ہے، اس کے ساتھ بعض لوگوں نے خواب میں دیکھا کہ فلاں قبر کے پاس دعا مانگی جائے مزارات پر لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی بھی دیکھی گئی ہیں، حتی کہ بعض مزارات اس سلسلے میں مشہور بھی ہیں، جیسے شیخ ابو الفرج شیرازی مقدسیؒ کی قبر، اور ہم نے بھی متعدد اہل علم اور اصحاب فضل کو دعائیں مانگتے اور وہاں مراقبہ یا اعتکاف کرتے دیکھا ہے، جن میں بعض صاحب کرامت لوگ بھی ہوتے تھے، یہاں تک تو "قبوریوں" (بقول شیخ الاسلامؒ) کے دلائل تھے، جواب میں شیخؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے اگر اس کی کراہت کا بیان کیا ہے تو اس لئے کہ اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں، نہ قرونِ ثلاثہ میں اس کا استحباب ثابت ہے، اور بعد کی امت اسلامیہ نے بھی اسے مکروہ ہی سمجھا، اور ویسے بھی امت کا اجماع کسی ایسی بات پر ہو ہی نہیں سکتا جسے متقدمین اور سلف نے برا سمجھا ہو۔

اور جو کچھ اس کے جواز میں منقول ہوتا ہے وہ کذب پر مشتمل ہوتا ہے، جیسے امام شافعیؒ کی طرف یہ جملہ منسوب ہے کہ جب کوئی مشکل پیش آتی ہے تو میں امام ابو حنیفہؒ کی قبر کے پاس دعا کرتا ہوں اور وہ قبول ہوتی ہے، لیکن یہ صراحۃً بے اصل ہے، اس لئے کہ امام شافعیؒ جب بغداد تشریف لے گئے ہیں تو وہاں کوئی معروف قبر نہیں تھی اس کے علاوہ امام شافعیؒ نے حجاز، یمن، شام، اور عراق و مصر میں انبیاء، صحابہ اور تابعین کی کتنی قبریں دیکھی ہوں گی لیکن کہیں ان سے دعا ثابت نہیں، خود امام ابو حنیفہؒ کے اصحاب میں

صاحبین، زفرؒ، حسنؒ، ابن زیاد وغیرہ کسی سے یہ ثابت نہیں کہ وہ امام صاحبؒ کی قبر پہ دعا مانگتے ہوں، اور امام شافعیؒ کا مسلک تعظیم قبور کی کراہت سے متعلق اوپر گزر بھی چکا ہے۔

یا اگر کسی نے ایسا کیا بھی ہو تو اسے اجتہادی غلطی ہی کہیں گے، یا جن لوگوں نے اجازت دی ہوگی انھوں نے ضروری شرائط کے ساتھ ہی دی ہوگی، پھر دعائیں تو مشرکین کی بھی قبول ہوتی تھیں اور ہوتی ہیں، جیسے بلعم بن باعورار کی دعا قوم موسیٰؑ کے حق میں قبول ہوئی لیکن وہ خود کافر ہی رہا۔ اور کسی کی دعا قبول ہوئی تو یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اسی قبر کی برکت سے قبول ہوئی بلکہ آدمی چند دعائیں مانگتا ہے اس میں ظاہر ہے کہ کوئی شاذونادر قبول ہو ہی جائے گی، لیکن اس نادر اتفاق کو سند میں پیش کرنا سفاہت ہی ہے۔

اور پھر ان قبروں سے بڑھ کر تو مخلصین کی دعا قبول ہوتی ہے، لوگ اگر صبح کو یا سجدوں میں، یا نماز کے بعد یا مسجدوں میں تضرع اور ابتہال کے ساتھ دعا مانگیں تو بغیر کسی مانع کے ان کی دعا قبول ہوگی، حضورؐ نے فرمایا ہے:

مامن عبد یدعو اللہ بدعوۃ	جب کوئی بندہ دعا کرتا ہے جس میں کوئی گناہ
لیس فیہا اثم ولا قطعیۃ رحم	اور قطع رحم نہ ہو تو اللہ اس کے بدلے میں
الا اعطاہ اللہ بہا احدی	تین میں سے ایک بات کرتا ہے، یا تو اس کی
خصال ثلاث: اما ان یعجل اللہ	دعا اسے دنیا ہی میں دے دی جاتی ہے یا
لہ دعوتہ او یدخر لہ من الخیر	آخرت کے لئے اٹھا رکھی جاتی ہے، یا اس
مثلہا او یصرف عنہ من الشر مثلہا	دعا کی مقدار کوئی مصیبت اٹھالی جاتی ہے

قالوا یارسول اللہ اذن نکثر،	لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! تب تو ہمیں خوب
قال: اللہ اکثر،	دعا مانگنی چاہیئے؟ فرمایا اللہ بھی تو خوب دینے
	والا ہے۔

کسی قبوری کی دعا قبول بھی ہوئی تو اس کے نتیجہ میں اس کے توحید میں نقص آجاتا، خدا کا تعلق کمزور پڑ جاتا، اور اس کا دل ایمان کی اس لذت و حلاوت سے محروم ہو جاتا ہے جیسے سابقین اولین محسوس کرتے تھے اور برکت بھی چھین لی جاتی ہے، شیخ الاسلام یہاں ایک حکمتِ ایمانی پر مشتمل بات کہہ رہے ہیں کہ تمام شرعی طور پر حرام چیزیں جن میں لوگوں کو بظاہر نفع محسوس ہوتا ہے، جیسے نجوم کے حساب.... ...... قوتِ ارادی کا غلط استعمال جیسے نظر لگانا یا سحر کرنا، حرام دعا مانگنا، غلط سلط تعویذ لکھنا، اور دوسرے غلط طبیعیاتی تجربے کرنا وغیرہ، ان سب کا فائدہ ان کے نقصان سے بہت کم ہوتا ہے، لیکن اس کے مقابلے میں شرعی طور پر مباح اور مستحب طریقے دینی اور دنیوی دونوں مفید ہوتے ہیں جیسے مادی اسباب میں تجارت و زراعت، اور معنوی وسائل میں توکل علی اللہ، اور اس کی مدد کا یقین، اس سے دعا مانگنا، اور شرعی طور پر متبرک مقامات پر مسنون دعاؤں کا مانگنا۔ نماز و زکوٰۃ ہی کو لے لیجئے کہ یہ تمام دینی اور دنیوی منافع کی حامل ہیں، پھر یہ کہ اسباب کو تو مسبب الاسباب ہی جان سکتا ہے ہم کیسے کسی دعا کے بارے میں یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس لئے قبول ہوئی اسی لئے انبیاء کا یہ طریقہ تھا کہ مخلوق کو وہی باتیں بتاتے تھے جن کا نفع یقینی ہوتا تھا، فلاسفہ کی طرح اسباب کائنات اور اسرارِ موت و حیات نہیں بتاتے تھے، اس لئے ان کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا یا موجب ضرر بن سکتے تھے۔

مشرکین کی دعا کی قبولیت کا سبب کبھی ان کا خدا کے لئے اخلاص ہی ہوتا ہے اگرچہ وہ اس کے بدلے میں عذاب بھی بھگتیں گے، جیسا کہ ثعلبہ نے حضورؐ سے کثرت مال کی دعا کی درخواست کی اور حضورؐ کی ممانعت کے باوجود اصرار کرتا رہا جس پر حضورؐ نے دعا فرمائی، اور بالآخر وہی کثرت مال دنیا و آخرت میں اس کی محرومی کا سبب بن گئی، ارشاد ہے:

ان الرجل لیسألنی المسألۃ فأعطیہ ایاھا فیخرج بھا یتابطھا نارًا فقالوا یا رسول اللہ فلم تعطیھم؟ قال یابون الا ان یسألونی ویابی اللہ لی البخل،

ایسے بھی آدمی ہوتے ہیں کہ مجھ سے سوال کرتے ہیں اور میں انھیں دیتا ہوں لیکن وہ سوال ان کے لئے عذاب نار بن جاتا ہے لوگوں نے عرض کیا کہ حضور آپ وہ سوال کیوں پورا کرتے ہیں؟ فرمایا کہ وہ اصرار کرتے ہیں اور اللہ تعالٰی مجھ پر سے بخل کا الزام دور کرتا ہے اور انھیں دے دیتا ہے۔

قرآن مجید میں اسی لئے کہا گیا:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ، (۷:۵۵)

اپنے رب سے آہستہ اور عاجزی سے دعا کرو وہ دعا میں حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ کسی بزرگ کی عبادت و دعا کو مقبول دیکھ کر اس کی نقل کرنے لگتے ہیں لیکن ان کے حق میں وہ نتائج نہیں نکلتے ہیں، اس لئے کہ نقل تو صورت کی ہے لیکن حقیقت موجود نہیں۔

بعض شیوخ کو خواب میں دیکھا گیا کہ ان سے اللہ تعالیٰ نے عتاب میں فرمایا:
"یا شیخ السوء انت الذی کنت تتمثل بسعدیٰ ولبنیٰ لولا اعلم انك صادق لعذبتك" (اے پیر فرتوت تم سعدی ولبنیٰ کے نام پر غزل کہتے تھے اگر مجھے تمہاری صداقت[1] نہ معلوم ہوتی تو عذاب دیتا۔)

سحنون محب سے نقل ہے کہ میرے دل میں ایک خیال آیا اور میں نے دجلہ کے کنارے جاکر دعا کی کہ تیری عزت کی قسم میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک میرے لئے مچھلی نہیں نکل آتی ــــ چنانچہ ایک بڑی مچھلی نکل آئی، لیکن جب حضرت جنیدؒ کو خبر ملی تو آپ نے فرمایا: میں تو چاہتا تھا کہ سانپ نکل کر اسے ڈس لیتا! ــــ اور ہم تک حکایت پہنچی ہے کہ مدینہ کے کسی مجاور نے قبر شریف پر آکر کسی کھانے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ اس نے ایک ہاشمی فرد کو دیکھا کہ وہ کھانا لے کر آرہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ یہ حضورؐ نے بھجوایا ہے ــ مگر یہ بھی فرمایا کہ یہاں سے نکل جاؤ، اس لئے کہ جو یہاں کا ہوتا ہے وہ ایسی خواہش نہیں کرتا (وقال لك: اخرج من عندنا فان من یکون عندنا لا یشتھی مثل ھذا)۔

دعا کے بارے میں کچھ تصریحات

حرام دعاؤں میں دین و دنیا کے لئے کسی نقصان رساں دعا کا مانگنا ہے، جیسے حضورؐ ایک شخص کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تو اس سے پوچھا تم نے

---

[1] یہاں صداقت سے مراد ان بزرگ کا صدق و اخلاص مع اللہ ہو سکتا ہے یا ان کے عشق صادق کی وجہ سے انھیں مغلوب الحال سمجھا گیا۔ (مرتب)

کوئی دعا مانگی ہے؟ اس نے کہا میں نے یہ مانگا تھا کہ مجھے جو عذاب آخرت میں ملنا ہے، یہیں مل جائے حضورؐ نے فرمایا تمہیں تو دنیا و آخرت دونوں کے لئے بہتری کی دعا مانگنا تھی ـــ جابر بن عتیک کے گھر والوں سے حضورؐ نے فرمایا کہ دعا ہمیشہ بہتر ہی مانگا کرو اس لئے کہ فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں ـــ بعض بزرگ لوگ بھی غصہ میں آ کر کسی کے لئے بددعا کر بیٹھتے ہیں لیکن اس کا عذاب انہی کو ملے گا۔

کفار اور فاسقین کی دعاؤں کی مقبولیت دراصل ان کے لئے استدراج اور مہلت ہوتی ہے جس کے بدلے میں وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے کبھی شیطان کسی بزرگ کی صورت میں آ کر کوئی کام کر دیتا ہے، جیسا کہ میرے سامنے اس کی مثالیں ہیں کہ وہ کام ہوا، لیکن خود ان بزرگ کو خبر نہیں ہوتی، یہاں تقدیر اور امور شرعیہ کی بحث سامنے آتی ہے کہ بعض امور تقدیری ہیں لیکن اللہ انھیں پسند نہیں کرتا، اور بعض شرعی طور پر مباح ہوتی ہیں لیکن بندے کی تقدیر میں نہیں ہوتیں اس لئے ان پر ثواب ملے گا، اور کبھی تقدیر شریعت کے مطابق ہوتی ہے، تب بھی اس کی دعا پر ثواب ملتا ہے، شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ یہ خدا کی رحمت ہے کہ مشرکانہ دعا سے مہمات امور میں کامیابی نہیں حاصل ہوتی بلکہ بعض چھوٹے مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے:

قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ	کہئے کہ تمہارا کیا خیال ہے اگر تم پر اللہ کا عذاب
أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُونَ	یا قیامت آجائے تو سچ بتاؤ کہ کیا اس وقت
إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ـ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ	کسی غیر اللہ کو پکارو گے؟ بلکہ اسی کو پکارو گے
فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ	تو وہ تمہاری مصیبت دور کر دے گا اگر

وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ۔

(۶: ۴۰، ۴۱)

چاہے گا اور اس وقت تم ان خداؤں کو بھلا دو گے جن کو شریک خدا کہتے ہو!

دوسری جگہ کہا گیا:

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِیَّاهُ فَلَمَّا نَجّٰكُمْ اِلَی الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا۔

(۱۷: ۶۷)

جب سمندر میں تم پر کوئی آفت آجاتی ہے تو اس وقت سارے خدا غائب ہو جاتے ہیں اور صرف ایک خدا باقی رہتا ہے اور جب وہ تمہیں نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو پھر تم سرکشی کرنے لگتے ہو انسان ہے بھی بڑا ناشکرا۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ۔ (۲۷: ۶۲)

مضطر و پریشان کی دعا کون سنتا، ۔۔۔ مصیبت دور کرتا، ۔۔۔ اور تمہیں زمین کی خلافت دیتا ہے؟

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا یَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا۔ (۱۷: ۵۶، ۵۷)

کہیے کہ اپنے مزعومہ خداؤں کو بلا دیکھو، وہ تمہاری مصیبت نہ ہٹا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں، اور کچھ لوگ دعا کرتے اور اپنے رب کا وسیلہ چاہتے ہیں، ان میں سے کون زیادہ قریب ہیں؟ اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں، آپ کے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہی ہے۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاءَ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ. قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا۔ (۳۹: ۴۳، ۴۴)

کیا انھوں نے خدا کے سوا کچھ اور شفاعت گار بنا لئے ہیں؟ کہئے کیا اس صورت میں بھی انھیں شفیع کہتے رہو گے کہ وہ کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے، اور نہ عقل رکھتے ہیں کہہ دیجئے کہ شفاعت تو تمامتر خدا کے ہاتھ میں ہے۔

بعض فلاسفہ اور متصوفہ دعا کو بیکار بتاتے اور کہتے ہیں کہ جس کی دعا مانگی جا رہی ہے یا تو وہ مقدّر ہو گی، اس صورت میں دعا تحصیل حاصل ہے، یا غیر مقدر ہو گی اس شکل میں دعا فضول ہے، وہ دعا کو تقدیر کی علامت کہتے ہیں سبب نہیں مانتے حالانکہ دعا ایک مستقل سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کی بھلائی چاہتا ہے تو اس کے دل میں دعا کی خواہش ڈال دیتا اور اس کی دعا کو تقدیر کا سبب بنا دیتا ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: إِنِّي لَا أَحْمِلُ هَمَّ الْإِجَابَةِ وَإِنَّمَا أَحْمِلُ هَمَّ الدُّعَاءِ فَإِذَا أُلْهِمْتُ فَإِنَّ الْإِجَابَةَ مَعَهُ" (مجھے قبولیت دعا کی فکر نہیں رہتی بلکہ صرف دعا کی فکر رہتی ہے، اس لئے کہ جب دعا کی توفیق ہوتی ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ قبولیت بھی اس کے ساتھ ہی ہے)

اسی کو مولانا رومؒ کہتے ہیں۔ ع

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو

شیخ فرماتے ہیں کہ اشیاء کا مبدء و معاد خدا ہی کی ذات ہے "فمنہ الامور

من اللہ وتمامہا علی اللہ"۔ ایک حدیث ہے کہ ایک صحابیؓ نے حضورؐ سے پوچھا:

"یارسول اللہ ارأیت ادویۃ نتداوی بہا ورقی نسترقی بہا وتقی نتقیہا: ھل ترد من قدر اللہ شیئاً قال: ھی من قدر اللہ"	یارسول اللہ! آپ کا کیا خیال ہے کہ دوائیں تعویذیں، اور پرہیز جو ہم کرتے ہیں کیا یہ تقدیر کو لوٹا سکتے ہیں؟ کہا یہ بھی تو تقدیر ہی ہیں!

دوسری حدیث میں ہے کہ "ان الدعاء والبلاء لیلتقیان فیعتلجان بین السماء والارض" (دعا اور بلا آسمان وزمین کے درمیان جب ملتی ہیں تو باہم کشمکش پیدا ہوتی ہے۔)

ہمارا عقیدہ ہے کہ دعا سے طے شدہ تقدیری مقاصد ہی نہیں بلکہ خارق عادت اور فوق الاسباب باتیں بھی حاصل ہو جاتی ہیں جیسے حضرت علاء حضرمیؓ نے "یا علیم یا حلیم یا علی یا عظیم اسقنا" کہہ کر دعا مانگی جس کے نتیجے میں تاریخ میں آتا ہے کہ گرمی کے موسم میں صرف ان کے لشکر تک بارش ہوئی (فمطر وافی یوم شدید الحر لم یجاوز عسکرھم) اسی طرح سمندر کو انھوں نے اس طرح پیدل طے کیا کہ ان کے قدم بھی نہیں تر ہوئے۔ (وقال احملنا فمشوا علی النھر الکبیر مشیا لم یبل اسافل اقدام دوابھم)۔

ایوب سختیانیؒ نے اپنے ساتھی کے لئے پہاڑ پر ایک ٹھوکر سے چشمہ جاری کر دیا جو پھر سیرابی کے بعد بند ہو گیا، دعا کی اہمیت اور اس کی تاثیر اسلام کے

مسلمات میں سے ہے۔ اور عملی زندگی میں دعا کے اتنے کھلے ہوئے اثرات اور برکات دیکھنے میں آتے رہتے ہیں کہ ان کا انکار حقیقت کا انکار بن جاتا ہے۔

قبر پر دعا کے چند احکام

قبر پہ دعا میت کے لئے تو جائز ہے لیکن کسی اور کے لئے ناروا ہے۔ اور خود صاحب قبر کے لئے بھی روزانہ کی حاضری جس سے بے جا اہمیت کا اظہار ہو نامناسب ہے، قبر نبویؐ کے بارے میں صحابہؓ کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ مسجد نبوی میں نماز کے لئے جب داخل ہوتے تو اسی وقت سلام کر لیتے قبر پہ نہیں جاتے تھے، کبھی کبھار بلا کسی پابندی کے البتہ حاضری دیدیتے تھے، حضرت ابن عمرؓ کا بھی یہی معمول تھا، جب سلف کا یہ معمول تھا تو یہی ہمارا بھی ہونا چاہیئے، امام مالکؒ نے کیا خوب فرمایا تھا کہ اس امت کے عہد اخیر کی اصلاح وہی طریقہ کر سکتا ہے جس نے اس کے اول کو سدھارا تھا (لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا ما اصلح اولھا)

شیخ الاسلامؒ قبر رسولؐ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ حجرۂ عائشہؓ میں تھی، لیکن بعد کے لوگوں نے حجرہ میں تبدیلی کر دی جس میں ولید بن عبدالملک کا بھی ہاتھ تھا، اس وقت مدینہ کے عامل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تھے، جنھوں نے ان اضافوں کو ختم کر کے حجرہ کو پورے طور سے مسجد شریف میں داخل کر دیا سعید بن المسیبؒ اور متعدد اہل علم نے اس تبدیلی کو ناپسند کیا، لیکن بہت سے علماء حکومت کے ساتھ بھی تھے، جہاں تک قبر نبوی کو چھونے اور مسح کرنے کا

سوال ہے اس کے بارے میں ابوبکر الاثرم کی امام احمد سے روایت ہے کہ انھوں نے اس سے لاعلمی ظاہر کی، انھوں نے منبر شریف کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ ہاں منبر چھو سکتے ہیں، اثرم نے کہا کہ "ابن ابی فدیك عن ابی ذئب عن ابن عمرؓ" کہہ کر لوگ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے منبر پہ مسح کیا تھا۔ امامؒ نے فرمایا کہ یہ روایت سعید بن المسیبؒ سے بھی ہے، رُمّانہ کے بارے میں ہے، میں نے کہا کہ اسے یحییٰ بن سعید سے بھی روایت کرتے ہیں کہ وہ عراق کے سفر کے موقع پر منبر کو مسح اور دعا کرتے ہوئے دیکھے گئے، امامؒ نے فرمایا کہ وہ کسی ضرورت سے ہوگا، امام احمدؒ نے منبر اور رُمّانہ کو (یعنی منبر کے اس دستے کو جس پہ آنحضورؐ دست مبارک رکھتے تھے) چھونا جائز کہا ہے لیکن قبر شریف کا مسح جائز نہیں کہا ہے، البتہ ایک روایت یہ ہے کہ امام احمد نے بعض افراد کے جنازے کی مشایعت کے بعد ان کی قبر پہ ہاتھ رکھ کر دعا کی ہے امام مالکؒ نے قبر شریف کی طرح قبر کو بھی چھونا مکروہ کہا ہے، آج تو جل جانے کے بعد نہ منبر ہے نہ رُمّانہ اور منبر کی صرف ایک جلی ہوئی لکڑی رہ گئی ہے جسے چھونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اس لئے کہ حضرت ابن عمرؓ سے منبر میں سے تشریف رکھنے کی جگہ کے چھونے کی روایت ہے نہ کہ مطلق منبر کے مسح کرنے کی، امام مالک اور امام احمد کا مسلک یہ ہے کہ قبر شریف کی طرف دعا نہ کرے بلکہ قبلہ رخ ہو کر دعا مانگے، متاخرین میں ابوالوفا ابن عقیل اور ابن جوزی کی بھی یہی رائے ہے۔

اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی صحابی، تابعی یا مشہور امام سے قبروں پہ

دعا کے قصد سے جانے کی اجازت ثابت نہیں، تیسری صدی کے بعد اہل بدعت کی کتابوں میں ایسی چیزیں ملنے لگیں، سلف سے صرف ایک رخصت کا پتہ ابن ابی الدنیا کی کتاب القبور میں ابن ابی فدیک کی روایت سے چلتا ہے، جس میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

من زارنی بالمدینہ محتسباً کنت لہ شفیعاً وشہیداً یوم القیامۃ	جس نے مدینہ آکر ثواب کی نیت سے میری قبر کی زیارت کی تو قیامت میں اس کے لئے میں شفیع اور گواہ بنوں گا۔

ابن ابی فدیک کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ جس نے قبر شریف پر "ان اللہ وملٰئکتہ یصلّون علی النبیّ" کی تلاوت کی اور ستر بار "صلے اللہ علیک یا محمد" کہا تو فرشتہ اس پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کی ہر حاجت پوری ہوتی ہے، لیکن یہ روایت متعدد وجوہ سے قابل اعتناء نہیں۔

(۱) ابن ابی فدیک نے یہ روایت مجہول شخص سے کی ہے، اور وہ خود دوسری صدی کے اواخر کے آدمی تھے اور تبع تابعین میں بھی نہ تھے، اور صحیح حدیث میں تو یہ ہے کہ "من صلیٰ علیہ مرۃ صلی اللہ علیہ عشرا" (جو حضورؐ پر ایک بار درود بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر دس بار رحمت کرتے ہیں ـــــ اور اس میں ہے کہ ستر بار کے بعد ایک فرشتہ جواب دیتا ہے۔

(۲) اس میں دعا کی نیت سے حاضری کا ذکر ہے، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ حاضری کے ضمن میں دعا کی بھی گنجائش ہے۔

(۳) مزار نبوی پر دعا کی مقبولیت کثرت درود کے ساتھ مشروط ہے،

جیسا کہ حضرت عمرؓ سے اثر منقول ہے کہ "الدعاء موقوف بین السماء والارض حتی تصلی علی نبیك" (دعا آنحضورؐ پر درود پڑھنے تک موقوف رہتی ہے۔ ترمذی)

محمد بن حسن بن زبالہ نے اخبار المدینہ میں لکھا ہے کہ اہل مدینہ میں سے ایک شخص کو جمعہ کے دن برابر عصر سے مغرب تک صلوٰۃ وسلام پڑھتے دیکھا گیا (یہ محمد بن حسن واقدی کی طرح ضعیف ہیں، لیکن تھوڑا بہت ان کی روایات کا اعتبار بھی ہے)

لیکن اسی میں ہے کہ ربیعہ بن عبدالرحمٰن کی مجلس کے لوگوں نے اسے تعجب کی نگاہ سے دیکھا تھا ابن وردان سے روایت ہے کہ انس بن امام مالکؒ سلام کے بعد قبر شریف کی دیوار پر پیٹھ ٹیک کر دعا کرتے تھے۔

اس باب میں ان روایات سے یہاں بحث نہیں جن میں آنحضورؐ پر سلام کا جواب سنا گیا ہے یا یہ کہ سعید بن المسیب واقعۂ حرہ کی راتوں میں قبر شریف سے آتی ہوئی اذان کو سنی تھی۔ یہ سب صحیح ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوسکتا ہے، والامر اجل من ذالك واعظم۔

بعض افراد کے سوال پورے بھی کئے گئے ہیں، لیکن یہ مناسب نہیں اس لئے کہ عدم اجابت کے وقت ایمان میں فتور آنے کا اندیشہ بھی کمزور لوگوں کے حق میں قائم ہے اسی طرح انبیا و صالحین کے مزارات کی برکات میں انوار اور ملائکہ کا نزول، شیاطین اور بہائم کا ان سے بچنا، آگ کا نہ لگنا، اور اپنے پڑوس کے لوگوں کی سفارش، ان کے قریب دفن ہونے کا استحباب اور انس وسکینہ کا حصول، بے ادبی

کرنے والوں پہ عذاب کا نزول، یہ سب حق ہے لیکن اس سے یہاں بحث نہیں۔

(۴) ایسی جگہوں پر دعا کی مقبولیت کا عقیدہ اس عدول حکمی تک پہنچائے گا کہ مزارات، عیدگاہ بن جائیں گے۔

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ کسی قبر پر پابندی سے تلاوت قرآن اور ذکر بدعت ہے اس لئے کہ یہ سب قبر کی بے جا اہمیت کی طرف لیجاتے ہیں — پھر میت کو ثواب پہنچنے کے بارے میں دو مسلک ہیں۔

ایک یہ کہ عبادات بدنیہ (صلوٰۃ و قرأۃ) کا ثواب میت کو ملتا ہے، جیسا کہ عبادات مالیہ کا ثواب بالاجماع اسے ملتا ہے، یہ امام احمد اور امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے اور امام شافعیؒ و امام مالکؒ کے بعض اصحاب کا بھی؛ اور یہی صحیح بھی ہے؛

دوسرا یہ کہ عبادات بدنیہ کا ثواب اسے کسی حال میں نہیں ملتا، یہی امام شافعیؒ و امام مالکؒ کے اصحاب کا مشہور مذہب ہے، بہرحال میت کا قرآن اور دوسری آوازیں سننا تو حق ہے لیکن مرنے کے بعد کے عمل پر اسے کوئی ثواب نہیں ملتا ہے، لیکن مردہ اپنے قریب کئے جانے والے معاصی سے پریشان ضرور ہوتا ہے، قبر پہ تلاوت کے باب میں امام احمدؒ سے تین روایات ہیں:

(۱) یہ کہ اس میں کوئی حرج نہیں، یہی خلال اور اکثر متاخرین حنابلہ کا مذہب ہے، بلکہ اسی کو امام احمد کا آخری قول بھی کہا گیا ہے، اور یہی احناف کی ایک جماعت کا کہنا ہے، اس بارے میں معتمد علیہ قول ابن عمرو کا ہے کہ انھوں نے اپنی قبر پر تلاوت کی وصیت کی تھی کہ دفن کے وقت سورۃ البقرہ کی شروع اور آخر کی آیتیں پڑھی جائیں، بعض مہاجرین سے اس کا پڑھنا ثابت بھی ہے۔

(۲) یہ کہ مکروہ ہے حتیٰ کہ نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ میں بھی اختلاف ہے کراہت کی روایت امام احمد کے اجل اصحاب: عبدالوہاب الوراق، ابوبکر المروزی، جمہور سلف: جیسے امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، ہشیم بن بشیر وغیرہ سے ہے اس بارے میں امام شافعیؒ کا کوئی قول منقول نہیں، اس لئے کہ یہ ان کے نزدیک بدعت ہے، امام مالکؒ کہتے ہیں کہ میں کسی کو بھی نہیں جانتا جو ایسا کرتا ہو۔

(۳) یہ کہ دفن کے وقت ان کے ہاں تلاوت میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ ابن عمرؓ کی روایت نقل ہوئی لیکن قرأت کے لئے مستقل آنا سلف سے ثابت نہیں۔

اسی طرح قبروں پر ذبیحہ بھی منع ہے رسول اللہؐ نے فرمایا "لا عقر فی الاسلام" (اسلام میں ایسا ذبیحہ نہیں۔ احمد و ابوداؤد) اسی طرح قبروں پر اعتکاف اور ان پر مجاور بن جانا ان کی خدمت اختیار کرنا ان پر پردے اور چادریں چڑھانا اور لٹکانا یہ سب بدعت ہیں اخیر میں شیخؒ فرماتے ہیں جو خیر کی طلب رکھتا ہے، وہ دیا جاتا ہے اور جو شر سے بچنا چاہتا ہے بچایا جاتا ہے۔ "فانہ من یتحری الخیر یعطہ ومن یتوقی الشر یوقہ"۔

مقامات مقدسہ کا حکم

علماء کے ایک قول میں ان مقامات میں عبادت کو ممنوع اور مکروہ کہا گیا ہے اور دوسرے قول میں ابن عمرؓ کے اس فعل سے دلیل لیکر اسے جائز کہا گیا ہے کہ وہ آنحضورؐ کی اتفاقی عبادت کی جگہوں کو بھی ڈھونڈ کر وہاں عبادت کرتے تھے۔ "انہ کان یتحری قصد المواضع التی سلکھا النبی صلے اللہ

علیہ وسلم۔

سندی الخواتیمی امام احمد سے حضرت ابن ام مکتومؓ کی روایت سے جواز کی روایت کرتے ہیں، امام بخاریؒ موسیٰ بن عقبہ سے روایت کرتے ہیں کہ سالم بن عبداللہ کو بھی حضرت ابن عمرؓ کے مقام عبادت کو تلاش کرتے دیکھا جاتا تھا، یہی روایت نافعؒ سے بھی ہے جن لوگوں نے اسے مکروہ سمجھا ہے ان کی دلیل سعید بن منصور کی سنن کی وہ روایت ہے جس میں حضرت عمرؓ نے لوگوں کو راستے کی ایک مسجد کی طرف لپکتے دیکھ کر روکا تھا حالانکہ اس میں حضورؐ نے نماز پڑھی تھی، آپ نے فرمایا:

ھکذا اھل الکتاب قبلکم: اتخذوا	تم سے پہلے اہل کتاب اسی طرح ہلاک ہوئے
آثار انبیائھم بیعا من عرضت لہ	تھے کہ انھوں نے اپنے انبیاء کے آثار
منکم الصلاۃ فیہ فلیصل ومن	کو عبادت گاہ بنالیا۔ جسے نماز واقعی
لم تعرض لہ الصلوٰۃ فلیمض۔	پڑھنا ہو وہ پڑھ لے ورنہ چلتا رہے۔

محمد بن وضاح جو شجرۃ الرضوان کے کٹنے کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ امام مالکؒ اور دوسرے علمائے مدینہ آثار مدینہ میں سوا قباؔ اور اُحد کے پابندی سے حاضری مکروہ سمجھتے تھے، حضرت سفیان ثوریؒ بیت المقدس گئے تو صرف نماز پڑھ کے چلے آئے۔ آثار کی زیارت نہیں کی، ابن عمرؓ کا فعل ذاتی اجتہاد پر مبنی تھا اسی لئے خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہؓ کو ہم ایسا کرتے نہیں دیکھتے۔

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ جمہور صحابہؓ کے طرز عمل پر عمل کرنا کسی ایک صحابیؓ کی روایت پر عمل کرنے سے بہتر ہے، لیکن متاخرین علماء اور بعض حنابلہ نے بھی

آنحضرتؐ کے اتفاقی مقامات ورود وعبادت کی زیارت کو بھی بہتر سمجھا ہے، جیسا کہ صحیحین میں عتبان بن مالکؓ سے روایت ہے کہ وہ جب معذور ہو گئے تو ان کی خواہش پر حضورؐ نے ان کے گھر جا کر نماز ادا کی جسے انھوں نے اسے اپنی مسجد کے لئے متعین کر لیا بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں عبادت سنت ہوتی ہے، جیسے صحیحین میں یزید بن ابی علید کی روایت ہے کہ سلمہ بن الاکوعؓ کو اسطوانہ کے پاس اکثر نماز پڑھتے دیکھا گیا اس لئے کہ حضورؐ وہاں نماز ادا فرماتے تھے، شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب نظیریں، حضرت ابن عمرؓ کی ہوں یا عتبانؓ کی انفرادی اور شخصی حیثیت رکھتی ہیں، جمہور صحابہؓ اور خصوصاً خلفائے راشدین کا طرزِ عمل اس کے برخلاف ہے۔

اس سلسلے میں یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ آنحضورؐ سے کسی مخصوص قبر کی زیارت اور اس کی روایت ثابت نہیں اور مستند مجموعۂ احادیث میں ایک صحیح روایت بھی اس بارے میں نہیں ملتی، اور جو دار قطنی کی روایت ہے وہ بھی باتفاق اہل علم ضعیف ہے، بلکہ خود قبر شریف کی زیارت کے متعلق احادیث بھی کذب و افترا ہیں، جیسے یہ روایات:

(۱) من زارنی وزار ابی ابراھیم الخلیل فی عام واحد ضمنت له علی الله الجنة۔	جس نے میری اور میرے جد امجد ابراہیم کی ایک ہی سال میں زیارت کی تو میں خدا کے پاس اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔
(۲) ومن زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی۔	جس نے میری زیارت میرے بعد کی اس نے گویا زندگی ہی میں زیارت کی۔
(۳) ومن حج ولم یزرنی	جس نے حج کیا لیکن میری زیارت کو نہ آیا تو

فقد جفانی۔ اس نے مجھ پر ظلم کیا۔

بس ایک روایت میں اتنا ہے کہ آپ کو اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی زیارت کی اجازت ملی تھی، اس کے بعد آپ نے تذکیر و تذکر کے لئے عام طور پر بھی زیارت قبور کی اجازت دی تھی، لیکن یہ رخصت چونکہ ممانعت کے بعد تھی اس لئے عبرت و موعظت کی ضرورت ہی تک محدود رہے گی، اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اس لئے کہ "بقدر الضرورات تبیح المحذورات" (اجازت ضرورت کی حد تک ہوتی ہے)

سحر و طلسمات کی بدعتیں

سحر تو اسلام میں بالکل حرام ہے اگرچہ بعض لوگوں نے صرف علم کی حد تک اس کی اجازت دی ہے، شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ تو صراحۃً سورج اور چاند ستاروں سے عبادت کی حد تک عقیدت رکھتے ہیں اور ان کے نام سے طرح طرح کی دعائیں اور تعویذات لکھتے ہیں، ان کے مناسب لباس اور انگشتریاں پہنتے ہیں اور ان کی رعایت سے مبارک اور مناسب اوقات کا یقین کرتے اور سعد و نحس کا حال بتاتے ہیں، یہ سب عمل خالص مشرکانہ عمل ہیں، اس کا رواج اس حد تک ہوا کہ علمائے اسلام بھی تصنیف کی حد تک اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اور ایک مشہور عالم[1] نے "السر المکتوم فی السحر و مخاطبۃ النجوم" لکھ ڈالی۔

---

[1] اس سے امام فخر الدین رازیؒ کی طرف اشارہ ہے، ان کی یہ کتاب دار الکتاب المصریہ (مکتبہ تیموریہ) میں موجود ہے، لیکن امام رازیؒ سے حسن ظن رکھتے ہوئے کتاب کے دیکھے بغیر کوئی قطعی فیصلہ کرنا ہمارے لئے دشوار ہے۔ (مرتب)

اور دوسرے لکھنے والوں میں طمطم ہندی، ملکوشا بابلی، ابن وحشیہ، ابو معشر بلخی، اور ثابت بن قرہ کے نام آتے ہیں، یہ لوگ سحر و طلسم کی وجہ سے شرک کی حد میں داخل ہو گئے،[۱] جن کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَاۤءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا اُولٰۤئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا۔ (۴: ۵۱، ۵۲)	کیا آپ نے انھیں نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا تھوڑا حصہ ملا ہے، وہ سحر و اوثان پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں سے کہتے ہیں کہ یہ ایمان والوں کے مقابلے میں زیادہ ہدایت یافتہ ہیں، انہی لوگوں پر خدا کی لعنت ہے اور جس پر خدا لعنت کرتا ہے، اس کا آپ کوئی مددگار نہیں پا سکتے۔

"جبت" کو سلف نے "سحر" اور "طاغوت" کو "اوثان" کہا ہے، اور بعض لوگ اسے "شیطان" بھی کہتے ہیں۔

---

[۱] سحر کا علم شرک نہیں بلکہ اس پر عمل و عقیدہ شرک ہے اگر کوئی سحر کے ابطال کے لئے سحر کو سیکھے تو اس میں کیا حرج ہے؟ اسی طرح نجوم اور فلکیات (ASTRONOMY) پر کتابیں لکھنا اور فلکیاتی سائنس پر کام کرنا شرک اور سحر میں کیسے داخل ہو سکتا ہے؟ اس لئے یہ کہا جائے گا کہ شیخ الاسلام کی مراد دوسری ہے یا وہ سحر کو بہت عام معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ (مرتب)

غیراللہ کی قسم کھانا

غیراللہ کی قسم حرام اور بدعت ہے اور ائمہ کا اتفاق ہے کہ یہ قسم واقع نہیں ہوتی، اور یہ اس لئے کہ خدا کے آگے کسی بھی مخلوق کی خواہ وہ نبی یا ولی ہی کیوں نہ ہو کوئی ہستی نہیں۔ قسم اور دعاؤں میں صرف خدا کے اسماء و صفات ہی کا نام لیا جا سکتا ہے، جیسا کہ ماثور اور مسنون دعاؤں میں ہے، "اللھم انی اسألك بان لك الحمد انت الله الحنان المنان، بدیع السموٰت والارض، یاذالجلال والاکرام" دوسری حدیث میں ہے" اللھم انی اسألك بانك انت الله الاحد احمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفوًا احد" ایک اور حدیث میں ہے اسألك بکل اسم ھو لك سمیت به نفسك او انزلته فی کتابك او علمته احدًا من خلقك، او استأثرت به فی علم الغیب عندك" اسی قسم کی دعائیں مشروع اور جائز ہیں" اسألك بمعاقد العزمن عرشك" (آپ کے عرش کی معزز نشستگاہوں کے طفیل مانگتا ہوں) کو کچھ لوگوں نے جائز کہا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ نے مکروہ کہا ہے، ابوالحسن قدوری کرخی کی شرح میں لکھتے ہیں۔

قال بشر بن الولید سمعت ابا یوسف	بشر بن ولید کہتے ہیں کہ میں نے امام
قال قال ابوحنیفة رحمه الله	ابویوسف سے سنا کہ امام اعظم فرماتے تھے
لا ینبغی لاحد ان یدعو الله	کہ کسی کو خدا کے سوا کسی اور کے واسطے سے

لا به واكره ان يقول بمعاقد العز من عرشك، او بحق خلقك وهو قول لابي يوسف قال ابو يوسف بمعقد العزمن عرشه هو الله فلا اكره هذا واكره بحق فلان او بحق انبياءك ورسلك وبحق البيت والمشعر الحرام بهذا الحق يكره	دعا مناسب نہیں ہے، اور "معاقد العز" کے واسطے سے کہنا اور مخلوق کے حوالے سے دعا مانگنا بھی مکروہ ہے، یہی امام ابو یوسفؒ کا بھی قول ہے، لیکن وہ فرماتے ہیں کہ اگر "معاقد" سے خدا ہی مراد ہے تو یہ مکروہ نہیں ہے، اس کے ساتھ ہی انبیا اور رسول، بیت اللہ، یا مشعر حرام کے واسطے سے دعا کرنا بھی مکروہ ہے۔

امام ابو یوسف کی دلیل وہ اثر ہے جس میں ہے کہ:

اسألك بمعاقد العزمن عرشك ومنتهى الرحمة من كتابك وباسمك الاعظم، وجدك الاعلى وكلماتك التامة۔	آپ سے عرش کی معزز کرسیوں، کتاب کے منتہائے رحمت، اسم اعظم، آپ کے بلند مرتبہ اور آپ کے مکمل کلمات کے واسطے سے سوال کرتا ہوں۔

لیکن یہ اثر بھی نزاعی ہے، اسی طرح حضرت ابو سعیدؓ کی ابن ماجہ والی روایت میں بھی کلام کیا گیا ہے جس میں ہے کہ:

اللهم انى اسألك بحق السائلين عليك وبحق ممشائى هذا، فانى لم اخرج اشرا ولا بطرا ولا رياءً ولا سمعةً، خرجت اتقاء سخطك	اے اللہ میں آپ کے سائلین کے اور اپنی اس رفتار کے واسطے سے دعا کرتا ہوں میں اکڑ کے ساتھ فخر اور ریا و شہرت کا طالب ہو کر نہیں نکلا ہوں میں تو آپ کے

وابتغاء مرضاتك اسألك ان تنقذنی من النار وان تغفرلی۔	غضب سے بچنے اور آپ کی رضا طلب کرنے کے لئے نکلا ہوں میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے آگ سے بچا لیجئے اور میری مغفرت کیجئے۔
وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامِ (۴:۱)	اس خدا سے ڈرو جس سے اس کے اور رشتوں کے واسطے سے سوال کرتے ہو۔

حمزہ کی قرأت میں "ارحام" پر اگر زیر پڑھا جائے تو یہ معنی ہوتے ہیں، اس لئے بعض لوگوں نے اسے جائز کہا ہے، اور نحویوں کا یہ کہنا کہ ضمیر مجرور پر عطف بلا اعادۂ جار کے نہیں ہوتا غلط ہے، اس لئے کہ عربی نظم و نثر میں اس کے برخلاف بھی مثالیں ملتی ہیں، جیسا کہ سیبویہ نے نقل کیا ہے کہ "ما فیہا غیرہ و فرسہٖ"[1]

اسی طرح "حدیث اعمیٰ" سے بھی "توسل" کا ایک گونہ جواز بظاہر نکلتا ہے جس میں ہے کہ:

جاء الی النبی صلے اللہ علیہ وسلم فسألہ ان یدعو اللہ ان یرد بصرہ فامرہ ان یتوضأ فیصلی رکعتین	ایک اعمیٰ حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور اللہ تعالےٰ سے اپنی بینائی کے لئے دعا کی فرمائش کی آپ نے وضو اور دو رکعتوں کا

---

[1] عاجز راقم کے خیال میں غیر اللہ کے واسطے سے دعا کی حرمت یا کراہت اگر کلیہ ہے تو اسے ایک استثنائی صورت بھی تو مانا جا سکتا ہے جبکہ خود اللہ تعالےٰ ہی اس کی اجازت دے رہے ہیں، واللہ اعلم بالصواب، (مرتب)

ویقول اللهم انی اسألك واتوجه الیك بنبیك محمد نبی الرحمة، یا محمد یا نبی الله انی اتوجه بك الی ربی فی حاجتی لتقضیها اللهم فشفعه فیّ، ودعا الله فرد الله علیه بصره

(نسائی وترمذی)

حکم دیا اور یہ دعا بتائی، کہ اس طرح کہے۔ اے اللہ میں آپ سے سوال کرتا ہوں اور آپ کے نبی، نبی الرحمۃ محمد کے ساتھ میں آپ کی طرف متوجہ ہوں اور اے محمد اے اللہ کے نبی میں آپ کو بیکر اپنے رب کی طرف اپنی حاجت کے لئے متوجہ ہوتا ہوں کہ آپ میری حاجت پوری کرادیں، اے اللہ انھیں میرے حق پر سفارش تجھنے بیکھ کر اس نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی بحال کردی

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر مومن بندوں کا حق رکھا ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

"وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ" (۳۰: ۴۷) (ہم پر مومنین کی مدد کا حق ہے) یا "كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ" (۶: ۵۴) (تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو ضروری ٹھہرالیا ہے) اور صحیحین میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا کہ "معاذ! جانتے ہو کہ خدا کا بندوں پر کیا حق ہے؟ انھوں نے کہا اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں"، فرمایا کہ "اس کا حق ان پر یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں، اور بندوں کا حق خدا پر جانتے ہو کیا ہے؟ انھوں نے کہا خدا اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں، فرمایا کہ ان کا حق یہ ہے کہ وہ انھیں عذاب نہ دے"، خدا پر اپنے اوپر کچھ واجب کرنے کے بارے میں

اختلاف ہے لیکن "مخلوق" کی طرح قیاس کرنا قدریہ کا عقیدہ ہے یعنی یہ کہ بندوں کی طرف سے کوئی حق خدا پر واجب ہوتا ہے یا کوئی ممنوع ہوتا ہے ایسا کہنا اہلسنت کے عقائد کے خلاف ہے۔

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ بعض "حقوق" کی تصریح کتاب وسنت میں موجود ہے انھیں پیش نظر رکھ کر ہی دعا مانگی جا سکتی ہے جیسے حدیث میں تین آدمیوں کے اعمال صالحہ کے واسطے سے دعا کرنے کی حکایت آئی ہے جو دفعۃً ایک غار میں بند ہو گئے تھے۔

اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ کبھی مشرکین کا اخلاص بھی دعا کی قبولیت کا سبب بن جاتا ہے اس لئے کہ خود قرآن میں اس کی تصریح ہے، لیکن اجابتِ دعا رضائے الٰہی کی دلیل نہیں ہوتی، روایات میں آتا ہے کہ نصاریٰ نے کسی اسلامی شہر کے محاصرے کے وقت اللہ تعالیٰ سے پانی کی دعا کی جو قبول ہوئی، اس پر عامۃ المسلمین میں بڑی کھلبلی مچی، اس موقع پر ایک بزرگ نے ایک اجتماع کیا جس میں فرمایا کہ اے اللہ تو نے ان نصاریٰ کے رزق کا بھی ذمہ لیا ہے، اس لئے کہ تو نے ہر مخلوق کا ذمہ لیا ہے، اسی وجہ سے تو نے ان کی دعا قبول کی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تو انھیں یا ان کے دین کو پسند کرتا ہے، اب کوئی ایسی نشانی بھی نازل فرما کہ تیرے بندوں کا ایمان سلامت رہے، چنانچہ یہ مخلصانہ دعا بھی قبول ہوئی اور ایک ایسی ہوا چلی کہ تمام نصاریٰ کا خاتمہ ہو گیا۔[۱]

---

[۱] حضرت تھانویؒ کے جدید ملفوظات میں اس قسم کا ایک دافعہ نظر سے گزرا کہ جنگ (باقی ۱۸۶پر)

اعمال صالحہ سے توسل کا ایک واقعہ حضرت فضیل بن عیاضؒ سے نقل ہے کہ انھیں عسر البول کی شکایت ہوئی تو انھوں نے دعا کی: "بحبی ایاک الا ما فرجت عنی" (آپ سے میری محبت کا واسطہ ہے کہ آپ میری تکلیف دور فرمائیں)، چنانچہ آپ شفایاب ہوئے، ایسی ہی ایک مہاجرہ عورت نے اپنے مردہ بیٹے کے لئے دعا کی کہ "اللھم انی اٰمنتُ بک وبرسولک وھاجرت فی سبیلک" (اے اللہ میں تجھ پر اور تیرے رسول پر ایمان لائی اور تیرے راستہ میں ہجرت کی) اس پر اس کا بیٹا زندہ ہو گیا، لیکن "اسألک بحق السائلین" والی حدیث کو عطیہ عوفی نے روایت کی ہے، جو ضعف سے خالی نہیں، اگر صحیح بھی ہو تو اسی باب سے ہو گی۔

دعا اور استعاذہ کی ایک فلسفیانہ بحث

آنحضورؐ نے ایک موقع پر اس طرح دعا مانگی تھی:

اعوذ برضاک من سخطک و بمعافاتک من عقوبتک واعوذبک منک لا احصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علیٰ نفسک۔	میں آپ کے رضا کے واسطے سے آپ کے عذاب سے اور آپ کے عفو کے طفیل آپ کی سزا سے اور آپ سے پناہ طلب کرتا ہوں میں آپ کی تعریف نہیں کر سکتا آپ تو ایسے ہی ہیں جیسا کہ اپنی تعریف کی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۷۵ کا) روس و روم میں لوگوں نے ترکوں کی فتح کے لئے حضرت مولانا گنج مرادآبادی سے دعا کی درخواست کی تو حضرت نے فرمایا کہ کیا روسی خدا کے بندے نہیں ہیں؟۔

مخلوق سے استعاذہ ائمہ کے ہاں جائز نہیں اس لئے یہاں سے لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ کلام اللہ اور دوسری صفات مخلوق نہیں اور دوسری حدیث میں بھی آیا ہے کہ حضورؐ فرماتے تھے "اعوذ بکلمات اللّٰہ التامات من شر ماخلق"۔ جمہور اہل سنت عفو باری کو وہ فعل مانتے ہیں، جو ذاتِ باری کے ساتھ قائم ہے اور ظاہر ہے کہ خدا کا کوئی فعل و عمل مخلوق نہیں، یہی امام احمدؒ و مالکؒ اور امام شافعیؒ و امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب کا قول ہے، عام اصحاب حدیث، صوفیہ، اور فلسفہ، و کلام کے بہت سے علماء کا بھی یہی مسلک ہے، اسی سے معتزلہ اور جہمیہ کا جواب بھی ہو جاتا ہے۔ محدثین، عام متکلمین جو صفات کے قائل ہیں، جیسے کُلّابیہ، اشعریہ، کرّامیہ وغیرہ کا استدلال یہ ہے کہ کلام اللہ اس لئے غیر مخلوق ہے کہ صفت جب کسی محل و مقام سے قائم ہوتی ہے تو اس کا حکم محل ہی کا ہوتا ہے، الگ نہیں ہوتا، چنانچہ جب اللہ تعالے کسی محل کے لئے علم و قدرت یا حرکت پیدا کر دیں تو خدا ہی عالم و قادر اور متحرک ہے لیکن اس محل کی وجہ سے عالم و قادر اور متحرک نہیں، (یعنی ذات الٰہی سے کسی صفت کا ظہور ذات کے دائرے میں ہو تو وہ مخلوق نہیں) لیکن اگر غیر ذات میں کوئی صفت پیدا ہوئی تو وہ محل موصوف مخلوق ہے، جیسے شجر موسیٰؑ میں کلام نازل کر دیا گیا تھا تو وہی متصف بالکلام تھا اور اسی نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ "انی انا اللّٰہ" (نعوذ باللّٰہ)۔

ان لوگوں کا کہنا مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جہاں پتھر بولیں، یا ہاتھ سے آواز آئے یا کنکریاں کلمہ پڑھیں، یا کائنات میں جو کچھ ہو وہ سب

خدا ہو، اس کے قائل جہمیہ، حلولیہ اور اتحادیہ جیسے گمراہ فرقے ہیں۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ افعال و صفات تو خدا ہی کی ذات کے ساتھ قائم ہیں، لیکن صفات کا اثر جن پر پڑتا ہے، وہ مخلوق ہیں، اس کے ساتھ ہی اہل سنت کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ صفات ذات سے الگ نہیں نہ وہ ذات پر کسی الگ اضافہ کی نوعیت رکھتے ہیں، اسی لئے امام احمدؒ نے جہمیہ سے اپنے مناظرے میں ایک بار فرمایا تھا کہ:

لانقول اللّٰه وعلمہٗ واللّٰه وقدرتہٗ واللّٰه ونورہٗ ولکن نقول اللّٰه بعلمہٖ وقدرتہٖ ونورہٖ ھو الٰہ واحد۔	ہم اس طرح نہیں کہتے کہ اللہ اور اس کا علم، اللہ اور اس کی قدرت، اللہ اور اس کا نور بلکہ یوں کہتے ہیں کہ اللہ اپنے علم، قدرت، اور نور کے ساتھ ایک اللہ ہے۔

"صلہ رحمی" کا واسطہ دے کر کچھ مانگنا توسل اور قسم بغیر اللہ کی تعریف میں نہیں آتا بلکہ وہ تو اکتسابی اسباب میں سے ایک ظاہری سبب ہے، جیسے انبیاء کی دعا، ان کے احکام کی اطاعت، اور ان پر درود کے ذریعہ دعا کی جاتی ہے، اسی باب میں عبداللہ بن جعفر کی روایت آتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ویسے جب حضرت علیؓ مجھے کچھ نہیں دیتے تھے، تو میں جعفر کا واسطہ دیتا جس پر وہ میرا سوال پورا کرتے، یہ صلہ رحمی تھی نہ کہ توسل، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ "ان من البر ان یصل الرجل اھل وُدِّ ابیہ بعد ان یولّی، (آدمی کو چاہئے کہ باپ کے بعد اس کے دوستوں کے ساتھ بھی سلوک کرے)۔

دوسری جگہ فرمایا:

ان من برّهما بعد موتهما الدعآ	والدین کا حق ہے کہ ان کے مرنے کے بعد
لهما، والاستغفار لهما وانفاذ	ان کے لئے دعا استغفار کیا جائے، اور ان
عهدهما من بعد موتهما، وصلة	کے عہد کو نباہا جائے۔ اور ان کے متعلقین
رحمك التي لا رحم لك الا من قبلهما	کے ساتھ صلہ رحمی کی جائے۔

توسل کے باب میں شیخ الاسلامؒ کی یہ عبارت بہت صریح ہے جس سے ان کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے:

فالتوسل بالانبياء والصالحين	انبیاء اور صالحین سے توسل کی دو شکلیں
يكون بامرين: امابطاعتهم و	ہیں، ایک یہ کہ ان کی اطاعت و اتباع
اتباعهم، واما بدعائهم وشفاعتهم	کا سہارا لیا جائے، دوسرے یہ کہ ان کی
اما مجرد دعاء الداعي وتوسله	دعا اور شفاعت کام آئے، لیکن صرف
بهم من غير طاعة منه لهم	دعا کرنا اور بغیر عمل کے توسّل چاہنا اور
ولا شفاعة منهم له فلا ينفعه	ان کی شفاعت کے بغیر کوئی کام نکل
وان عظم جاه احدهم عند	جانا ممکن نہیں، اگرچہ کسی نبی و ولی کا
الله تعالى۔	عنداللہ کیسا ہی مرتبہ کیوں نہ ہو۔

مقامات مقدسہ پر مزید روشنی

حضرت ابن عمرؓ کے طرزِ عمل کی توجیہ میں شیخ الاسلام نے فرمایا ہے کہ وہ ان مقامات کے لحاظ سے اتباع سنت کے اعمال نہیں انجام دیتے تھے

ان کا مقصد تو اتباع سنت تھا، نہ کہ وہ مقامات۔

پھر اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر ایسے مقامات راہ میں ہیں، تو وہاں زیارت و دعا کی جا سکتی ہے، لیکن اس کے لئے باقاعدہ سفر جائز نہیں، جیسے کوئی غار حرا، غار ثور، کوہ طور، جبل قاسیون، جبل الفتح پر جا کر دعا اور عبادت کرے تو یہ مستحسن نہیں۔

جبل حرا کی بھی کوئی خصوصیت نہیں اس لئے کہ بعثت سے پہلے جاہلیت میں بھی قریش وہاں جاتے اور عبادت کرتے تھے، حضرت ابوطالب کا مصرع ہے۔ ع

وراقٍ لیرقیٰ فی حراءٍ ونازلٍ!

بعثت کے بعد آپؐ مکہ میں ۱۲ سال قیام پذیر رہے، لیکن کبھی حرا کی زیارت کو نہیں گئے، اور نہ کوئی صحابی گئے۔ پھر ہجرت کے بعد آپ نے چار عمرے کئے، مگر غار حرا کی زیارت کو کبھی نہیں گئے، اور مقاماتِ حج کے سوا کہیں نہ گئے۔

اسی طرح مکہ کے جو متبرک مقامات مشہور ہیں، ان کے بارے میں احتیاط کی ضرورت ہے ـــــ حج کے سلسلے میں حجر اسود کے سوا خانۂ کعبہ کے کسی جزء کا بوسہ ثابت نہیں اور رکن یمانی کے سوا رکن شامی کا استلام[1] بھی ثابت نہیں، یہاں

---

[1] شاہ ولی اللہؒ نے بھی حج میں صرف رکن یمانی کا استلام لکھا ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ ۶۰/۲ رشیدیہ دہلی ۱۳۷۳ھ)

ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت معاویہؓ حج میں ایک ساتھ تھے، حضرت معاویہؓ نے چاروں ارکان کا استلام کیا جس پر حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ صرف رکن یمانی کا استلام جائز ہے، اس پر حضرت معاویہؓ بولے کہ بیت اللہ کی کوئی چیز چھوڑنے کی نہیں، اس پر حضرت ابن عباسؓ نے اسوۂ رسول کی اتباع والی آیت پڑھی جس کے بعد حضرت معاویہؓ نے ان سے اتفاق کیا، اسی طرح مقام ابراہیمؑ کا استلام و تقبیل جائز نہیں، بلکہ یہ عام حکم یاد رکھنا چاہیئے کہ حجر اسود کے سوا تقبیل اور رکن یمانی کے سوا استلام کہیں جائز نہیں۔

اور جب مقام ابراہیم کے بارے میں کوئی تعظیمی حکم نہیں تو قدم رسولؐ اور دوسرے مقامات کا حکم بھی اسی سے معلوم ہو جاتا ہے، مسجد جمرات، مسجد غار المرسلات، مسجد الکبش وغیرہ کی زیارت بھی غیر مشروع ہے۔

مسجد قباء کے بارے میں صحیحین میں ہے کہ آنحضرتؐ ہر شنبہ کو پیدل یا سوار وہاں تشریف لاتے تھے، سنن میں حضرت اسید بن حضیرؓ سے روایت ہے کہ "الصلاۃ فی مسجد قباء کعمرۃ" (مسجد قبا کی نماز عمرہ کے برابر ہے)۔ (ابن ماجہ و ترمذی)

لیکن اس کے لئے علماء نے شد رحال سے منع کیا ہے، اس لئے کہ وہ صرف مساجد ثلثہ کے لئے ہے۔

فتح بیت المقدس کے موقع پر حضرت عمرؓ نے "صخرہ" کو ملبے کے نیچے دبا پایا، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہودیوں کو اس کی طرف نماز پڑھتے دیکھ کر

عیسائیوں نے ان کی ضد میں اس پر کوڑا ڈالنا شروع کر دیا تھا، حضرت عمرؓ نے اپنے دامن میں اس کوڑے کو اٹھایا، اور مسلمانوں نے بھی ان کی تقلید کی پھر آپ نے نبطیوں کو اس کام پر لگا دیا اور وہ کوڑا بالآخر صاف ہو گیا، پھر آپ نے حضرت کعب الاحبارؓ سے مشورہ کیا کہ مسلمانوں کے لئے مسجد کہاں بناؤں؟ انھوں نے کہا صخرہ کے پیچھے حضرت عمرؓ خفا ہوئے اور فرمایا "یا ابن الیھودیۃ خالطتك الیھودیۃ" (یہ تمہارا یہود نوازانہ مشورہ ہے) اور پھر آپ نے صدر مقام پر مسجد بنائی، یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ حضرت عمرؓ نے نہ صخرہ کے پاس نماز پڑھی اور نہ اسے مس کیا اور نہ مسلمانوں نے ایسا کیا، بلکہ محراب داؤد کے پاس آپ سے نماز ثابت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ بیت المقدس میں نماز تو پڑھتے تھے لیکن صخرہ اور دوسرے مقامات کے پاس نہیں جاتے تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، امام اوزاعیؒ، اور حضرت سفیان ثوریؒ کے متعلق بھی یہی آتا ہے، صخرہ کا قبہ عبدالملک بن مروان نے ایک سیاسی مقصد کے تحت بنایا تھا، حضرت ابن زبیرؓ چونکہ مکہ میں مقیم تھے، اس لئے لوگوں کا ان کی طرف رجوع دیکھ کر عبدالملک نے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے صخرہ کو آلہ کار بنایا، اور لوگوں نے کعب الاحبارؓ وغیرہ سے اسرائیلی روایات بھی منسوب کرنا شروع کر دیں، جیسے کسی نے عبدالملک کی مجلس میں یہ روایت بیان کی کہ "خدا نے صخرہ سے کہا ہے کہ تو میرا نچلا عرش ہے"، اس پر عروہ بن زبیر نے

جو وہاں موجود تھے کہا کہ خدا تو کہتا ہے کہ اس کی کرسی ارض وسماوات کو محیط ہے، اور تم یہ کہتے ہو صخرہ کی بس یہ حقیقت ہے کہ وہ یہود کا قبلۂ منسوخ ہے، صحابہؓ میں سے کسی سے اس کی کوئی تعظیم منقول نہیں، اکثر اسرائیلیات کعب الاحبار ہی سے مروی ہیں، جن کے بارے میں حضرت معاویہؓ کہتے ہیں کہ کعب کی روایات میں ہمیں کبھی کذب کا بھی شبہ ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ محدثین تو ائمہ اعلام کی......... مراسیل بھی نہیں قبول کرتے تو کعب کی روایات جو ہزاروں سال پہلے سے متعلق ہوتی ہیں کیسے قبول کر لیتے ہیں۔

سوال ودعا صرف خدا سے

صحیح حدیث میں ان لوگوں کی صفت بیان ہوئی ہے جو بغیر حساب جنت میں جائیں گے:

هم الذين لا يسترقون	یہ وہ لوگ ہوں گے جو کسی سے... تعویذ
ولا يكتوون ولا يتطيرون	بھی نہ مانگتے ہوں گے اور نہ بدن پر داغ
وعلى ربهم يتوكلون۔	لگاتے ہیں اور نہ فال نکلواتے ہیں بلکہ
	اپنے خدا پر بھروسہ کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ سے حضور رسالتمآبؐ نے فرمایا: اذا سألت فاسأل الله واذا استعنت فاستعن بالله (جب مانگو تو خدا سے

مانگو اور جب مدد چاہو تو خدا سے چاہو)۔

شرک سے توحید کو اتنی چڑھ ہے کہ شرک کا شبہ پیدا کرنے والے الفاظ سے روک دیا گیا:

حضورؐ نے فرمایا:

لا یقولن احد کم ماشاء اللہ وشاء محمد بل ماشاء اللہ، ثم شاء محمد۔	کوئی یوں نہ کہے کہ "جو خدا چاہے اور جو محمد چاہے" بلکہ جو خدا چاہتا ہے محمد اسے بعد میں چاہتے ہیں۔

کسی نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا "جو خدا اور آپ چاہیں" اس پر حضورؐ نے اسے تنبیہ کی کہ "اجعلتنی للہ ندا؟ قل ماشاء اللہ وحدہٗ" (کیا تم مجھے خدا کا شریک بنا رہے ہو؟ یوں کہو کہ صرف وہ ہو جو خدا چاہے)۔

بدعت و مشابہت سے پرہیز، دین کا تقاضا ہے

اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔ (۱۸: ۱۱۰)	جو اپنے رب سے ملنا چاہتا ہے وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔

حضرت عمرؓ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے:

اللھم اجعل عملی کلہ صالحًا	اے اللہ میرا ہر عمل نیک بنا، اور اسے

واجعله لوجهك خالصاً — اپنے ہی لئے بنا اور کسی دوسرے کا
ولا تجعل لاحدٍ فیہ شیئاً۔ — اس میں کچھ نہ رکھ۔

فضیل بن عیاضؒ فرماتے تھے کہ جب تک کوئی عمل خالص خدا کے لئے اور سنت کے مطابق نہ ہو، وہ مقبول نہیں۔

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ لفظ "اسلام" سپردگی اور خالص اطاعت وانقیاد کے معنوں میں آتا ہے، جیسے فرمایا گیا:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ۔ (۲۹:۳۹) — اللہ مثال دیتا ہے کہ ایک وہ غلام ہے جس میں کئی شریک ہیں، اور ایک وہ خالص ایک کا ہے۔

یہاں "سلماً" کو خالص کے معنی میں استعمال کیا گیا، اسی کے مقابل "استکبار" آتا ہے، جس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا کہ "جس کے دل میں کبر کا ایک ذرّہ بھی ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا لوگوں نے عرض کیا حضور! آدمی چاہتا ہے، کہ اس کے کپڑے اور اس کے جوتے اچھے ہوں، کیا یہ بھی کبر ہے؟ فرمایا نہیں! اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، کبر تو حق سے روگردانی اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے، قال لا۔ ان اللہ جمیل یحب الجمال الکبر بطر الحق وغمط الناس۔"

یہود کو قرآن نے کبر کی اسی صفت سے موصوف کیا ہے[1]، اور نصاریٰ کو

---

[1] حدیث میں کبر کی جو تعریف آئی ہے اور قرآن نے انھیں جس طرح متکبر کہا ہے (باقی ص۱۸۶ پر)

شرک سے متصف ثابت کیا ہے، یہود کے لئے کہا گیا:

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ؟ (۲: ۸۷)	کیا جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول تمہاری مرضی کے خلاف کوئی حکم لایا تو تم نے تکبر نہیں کیا؟

شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ "اسلام" ہر نبی کا دین رہا ہے، اس لئے کہ سب میں توحید و رسالت، ایمان و یقین، قیامت و آخرت، حشر و نشر، جزا و سزا کا عقیدہ مشترک رہا ہے، اسی لئے حضورؐ نے فرمایا: "اِنَّا معاشر الانبیاء دیننا واحد" (ہم تمام انبیاء کا دین ایک ہی ہے)۔ کہیں فرمایا: "الانبیاء اخوۃ لِعَلّات" (تمام انبیاء باپ شریک بھائی ہیں) ایک جگہ ارشاد ہوا: "ان اولی الناس بابن مریم لانا فلیس بینی وبینہ نبی" (ابن مریمؑ سے میں سب سے زیادہ قریب ہوں کہ میرے ان کے درمیان کوئی دوسرا نبی نہیں) شیخ فرماتے ہیں کہ دین کی بنیاد پر کبھی اختلاف نہیں ہو سکتا، بلکہ اختلاف تو بدعتوں اور جدتوں سے شروع ہوتا ہے، اسی لئے بے دین گروہوں کے قبلۂ مقصود جدا جدا ہیں اور ان میں کوئی نقطۂ اشتراک اور رشتۂ اتصال نہیں:

وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۔ (۱۱: ۱۱۸، ۱۱۹)	یہ لوگ ہمیشہ جھگڑتے رہیں گے، سوا ان کے جن پر خدا کا رحم و کرم ہے۔

(باقی ص۱۸۵ کا) اسے آج بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح یہود اپنے مذہب، اپنی نسل، کو تمام دنیا سے برتر سمجھتے اور صرف اپنی قوم کو خدا کی مخلوق سمجھ کر دوسروں سے نفرت کرتے ہیں۔ (مرتب)

خدا کے بارے میں انبیاءؑ اور فلاسفہ کا طرزِ تصور

شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء ہمیشہ خدا کی ذات وصفات کے اثبات پر زور دیتے تھے، اور ان کے استدلال کا پہلو مثبت ہوتا تھا، اس لئے کہ وہ حقیقی علم رکھتے تھے، اور حقیقت کا ادراک ان کو مشاہدہ کی حد تک تھا، لیکن اس کے برخلاف فلاسفہ منفی طرزِ استدلال اپناتے ہیں، اور صفات باری کی نفی و تنزیہہ میں اتنی دور جا نکلتے ہیں کہ اثبات کی منزل گم ہو جاتی ہے، اور اثباتِ ذات کے لئے اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک وجود مطلق ہے، بشرط النفی یا بشرط الاطلاق، اور منطق یونانی میں طے ہے کہ مطلق بشرط الاطلاق خارج میں موجود نہیں ہو سکتا، جیسے حیوان مطلق کا وجود خارج میں نہیں، اور نہ انسان مطلق کا وجود ہے، اس لئے کہ خارج میں معیّن و مشخص کا ہی وجود ہو سکتا ہے، قرآن انبیائی طرز پر زور دیتا ہے:

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ۔ (۳۷: ۱۸۰) — آپ کا رب ان کی مجوزہ صفات سے بہت بلند ہے۔

انبیاء کا طرز اثبات مفصل اور نفی مجمل ہے، یعنی خدا کی ذات و صفات کا تفصیلی بیان لیکن نفی صفات میں اجمال و اختصار! قرآن میں جگہ جگہ خدا کے صفات کا بیان ہوا، لیکن نفی کے متعلق چند ہی آیتیں ہیں، اور ان میں بھی عموم و اجمال ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ۔ (۴۲: ۱۱) — اس جیسا کوئی نہیں۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ	اس کا کوئی شریک نہیں۔
هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا؟ (۱۹:۶۵)	کیا آپ اس کا کوئی ہم نام بھی بتا سکتے ہیں؟
فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (۲:۲۲)	خدا کا شریک نہ بناؤ۔[1]
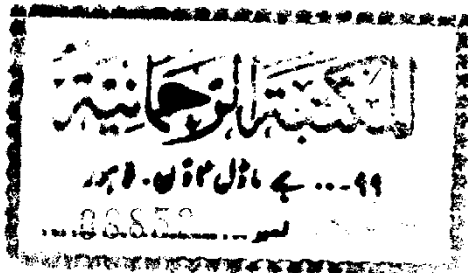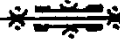
[1] ہندوستان کے فلسفہ میں بھی جو نیتی نیتی کی تکرار ہے، اس سے بھی شیخ الاسلامؒ کی رائے کی تائید ہوتی ہے، مولانا آزاد مرحوم نے ترجمان القرآن میں اس پر بڑی اچھی بحث کی ہے۔ (مرتب)